وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا

تفسیرِ رضی

جلد اول

از افاداتِ محقق خبیر علامہ سید محمد رضی صاحب قبلہ زنگی پوری مرحوم

ناشر الجواد بکڈپو جوادیہ کالج بنارس

مطبوعہ اکرام حسین لیتھو الیکٹرک مشین پریس پرہلاد گھاٹ بنارس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لولیہ والصلوٰۃ علیٰ نبیہ والسلام علیٰ وصیہ

امابعد! یہ ایک گراں بہا تفسیر قرآن ہے جسے محقق بصیر جناب مولانا سید محمد رضی صاحب قبلہ زنگی پوری مرحوم نے آج سے تقریباً ۳۵ سال قبل حسب ایمائے عالم ربانی حضرت نجم العلماء رحمہ بانی مدرسۃ الواعظین تحریر فرمایا تھا۔ چنانچہ اس کی ایک جلد مع مقدمہ تفسیر مصنف علاّم رحمہ نے جناب مغفور کے حوالہ کر دی تھی لیکن قبل اشاعت وہ جلد مدرسۃ الواعظین سے گم ہو گئی۔ اس کے بعد مصنفِ مرحوم نے نہ کوئی مقدمہ از سرِ نو لکھا نہ اصل تفسیر کے مسودے کو صاف کیا بلکہ تاحیات دیگر مشاغلِ علمیہ کی طرف متوجہ رہے۔ البتہ جامعہ جوادیہ کے زمانۂ قیام میں مرحوم نے چند بار اپنی تفسیر کے خصوصیات کا ذکر کیا تھا جسکی وجہ سے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ تفسیر قرآن کا منظرِ عام پر آجانا ضروری ہے مگر افسوس کہ یہ خیال سوقت پورا ہو رہا ہے جبکہ وہ خود اس عالم میں نہیں ہیں ورنہ ان سے مقدمہ بھی لکھوایا جاتا اور تفسیر پر نظرِ ثانی کی زحمت بھی دی جاتی۔

سببِ اشاعت مرحوم کو حقیر پر کچھ ایسا اعتماد تھا کہ آخر وقت اپنے تمام غیر مطبوعہ مسودے بلکہ کتابیں بھی میرے حوالہ کر دیں۔ کتابیں کتبخانہ جامعہ جوادیہ میں محفوظ ہیں اور مسودے دفتر "اجواد" میں موجود ہیں جن میں سے کچھ مستقل رسالہ طبع ہو چکے ہیں اور باقی بھی انشاء اللہ رفتہ رفتہ اشاعت پذیر ہونگے۔ مگر ان رسالوں کیوجہ سے "تفسیرِ رضی" (یہ نام حقیر نے تجویز کیا ہے) کی اشاعت میں تاخیر ہوتی جا رہی تھی۔ کچھ تو باخبر حضرات کا تقاضا، پھر زیادہ تر یہ خیال کہ اپنی زندگی کا کیا اعتبار۔ خود کچھ نہیں کر سکا تو وہ جو کچھ کر گئے ہیں انھیں کے کام سے دنیا کو فیض پہنچا کر اپنے لئے زادِ آخرت مہیا کر لیا جائے۔ بس اس ذاتی غرض نے باوجود بے سروسامانی کے اس تفسیر کی اشاعت کو ہر چیز پر مقدم بنا دیا۔

الحمد للہ کہ تفسیر رضی جو اہم مباحث پر مشتمل ہے اسکی طبع ثانی کی نوبت آگئی ہے اور خوشی کا مقام ہے کہ وہ اپنے "اکرام حسین قومی پریس" میں طبع ہو رہی ہے بلکہ یوں عرض کروں کہ پریس کے کام کی ابتدا اسی تفسیر سے ہو رہی ہے۔ چونکہ "تفسیر رضی" کی جلد اوّل بالکل ختم ہو چکی تھی لہٰذا ابھی یہی جلد طبع کی گئی ہے۔ ارادہ ہے کہ اگر بعض احباب کا ترتیب دادہ خاکہ عملی ہو گیا تو قرآن مجید مترجم مع اس تفسیر کے طبع ہوگا ——— "

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ وآلہ الکریم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اس آیۂ مبارکہ کے متعلق چند امور قابل تفصیل ہیں۔

بسم اللہ کا مستقل آیت قرآن ہونا (اول) اہلبیت نبوی علیہم السلام اور علماء شیعہ امامیہ کا اس پر اجماع واتفاق ہے کہ یہ ایک مستقل آیت ہے اور سورۂ فاتحہ کا جزء ہے۔ جن سات آیتوں کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے سورۂ فاتحہ کو "سبع مثانی" کہا گیا ہے۔ ان میں کی ایک آیت یہ ہے۔ اور نہ صرف سورۂ فاتحہ بلکہ سورہ برأۃ کے سوا تمام سورتوں کا جزء ہے۔ عمداً جو شخص اس کو نماز میں نہ پڑھے اس کی نماز باطل ٹھہرے گی۔

علاّمہ طبرسی نے فرمایا ہے (مجمع البیان)

اتفق اصحابنا انھا اٰیۃ من سورۃ الحمد ومن کل سورۃ وان ترکھا فی الصلوٰۃ بطلت صلاتہ سواءً کانت الصلوٰۃ فرضاً او نفلاً وانہ یجب الجھر بھا فیما یجھر فیہ بالقرأۃ ویستحب الجھر بھا فیما یخافت فیہ بالقرأۃ۔

"ہمارے اصحاب (علمائے شیعہ) کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ (بسم اللہ) "سورۂ حمد" کی ایک آیت ہے اور ہر سورہ کی آیت ہے، اور اگر کوئی شخص اسکو (بالقصد) ترک کریگا تو اسکی نماز باطل ہو گی۔ خواہ وہ نماز واجب ہو یا سنت اور اس پر (بھی اتفاق ہے) کہ جہری قرأت میں اسکو بلند آواز سے پڑھنا واجب ہے۔ اور اخفاتی قرأت میں بلند آواز سے پڑھنا مستحب ہے"

اہلسنت کا اعتراف اس قول کو اسلام کے دوسرے فرقوں کے اہل تحقیق کی حمایت وتائید بھی حاصل ہے تفسیر کشاف میں ہے:-

وقرأ مکۃ والکوفۃ وفقھاؤھما علیٰ انھا اٰیۃ من الفاتحۃ ومن کل سورۃ وعلیہ الشافعی واصحابہ ولذالک یجھرون بھا وقالوا قد اثبتھا السلف فی المصحف مع توصیتھم بتجرید القرآن ولذالک لم یثبتوا اٰمین فلولا انھا من القرآن لما اثبتوھا وعن ابن عباس من ترکھا فقد ترک مائۃ واربع عشر اٰیۃ من کتاب اللہ تعالیٰ۔

مکہ اور کوفہ کے تمام قاری اور کل فقہا اس پر متفق ہیں کہ یہ (بسم اللہ) سورۂ فاتحہ کی اور ہر سورہ کی ایک آیت ہے اور یہی مسلک امام شافعی اور ان کے اصحاب کا ہے اور اسی وجہ سے وہ اسکو بلند آواز سے پڑھتے ہیں اور ان حضرات نے دلیل میں یہ کہا ہے کہ بسم اللہ کو قرآن (یعنی قرآن میں) اسلاف نے تحریر کیا ہے۔ حالانکہ تجرید قرآن (یعنی قرآن میں صرف قرآنی آیات تحریر کرنے کی وہ برابر وصیت

کرتے تھے اس بنا پر ان لوگوں نے قرآن میں "آیۃ" کو نہیں درج کیا۔ پس اگر بسم اللہ قرآن کا جزو نہ ہوتا تو لوگ اسکو قرآن میں نہ درج کرتے۔ اور نہ ابن عباس کی روایت ہے کہ جس نے بسم اللہ کو ترک کیا اس نے کتاب خدا کی ایک سو چودہ آیتوں کو ترک کر دیا۔"

تفسیر کبیر میں ہے

وقال قرأ مکۃ والکوفۃ واکثر فقہاء الحجاز انہا آیۃ من الفاتحۃ وھو قول ابن المبارک والثوری

مکہ اور کوفہ کے تمام قاری اور حجاز کے اکثر فقہاء اس پر (متفق) ہیں کہ (بسم اللہ) سورۂ فاتحہ کی ایک آیت ہے اور یہی ابن مبارک اور ثوری کا قول ہے۔"

علامہ طبری کے کلام منقول بالا سے معلوم ہوا کہ جن نمازوں میں سورہ فاتحہ کو بلند آواز سے پڑھنا واجب ہے ان میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بھی بلند آواز سے پڑھنا واجب ہے اور جن نمازوں میں سورۃ الفاتحہ کو آہستہ پڑھنا واجب ہے ان میں اس آیت کو بلند آواز سے پڑھنا مستحب ہے۔ مجتہدین عامہ مسلمین میں سے امام شافعی بھی اس آیت کو ہر نماز میں بآواز بلند پڑھنے کے مؤید ہیں۔

تفسیر کبیر میں ہے۔

واما الشافعی فانہ قال انہا آیۃ منہا ویجہر بہا۔

لیکن امام شافعی کا قول ہے کہ "بسم اللہ" سورۂ فاتحہ کی ایک آیت ہے۔ اور اس کو بلند آواز سے پڑھا جائے گا۔"

علامہ فخر الدین رازی نے اس قول کی صحت پر بہت سی حجتیں اور دلیلیں لکھی ہیں۔ جن کے ذیل میں فرمایا ہے کہ :-

رسولؐ و اصحابِ رسول کا بسم اللہ کو بلند آواز سے پڑھنا

(الحجۃ الخامسۃ) روی البیہقی فی السنن الکبیر عن ابی ھریرۃ قال کان رسول اللہ یجھر فی الصلوٰۃ ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم ثم ان الشیخ البیہقی روی الجھر عن عمر ابن الخطاب وابن عباس وابن عمر وابن الزبیر واما ان علی ابن ابی طالب کان یجھر بالتسمیۃ فقد ثبت بالتواتر ومن اقتدیٰ فی دینہ بعلی بن ابیطالب فقد اھتدیٰ والدلیل علیہ قولہ علیہ السلام اللھم ادر الحق مع علی حیث دار

(جلد اول صہ ۵۹ مطبوع مصر)

(پانچویں دلیل۔) بیہقی نے سنن کبیر میں ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا کہ رسول خدا نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بلند آواز سے پڑھا کرتے تھے۔ پھر شیخ بیہقی نے بلند آواز پڑھنے کی روایت عمر ابن خطاب اور ابن عباس اور ابن عمر اور ابن زبیر سے کی ہے لیکن علی ابن ابیطالب کا بسم اللہ کو بآواز بلند پڑھنا تو بذریعہ تواتر ثابت ہے اور جو شخص اپنے دینی امور میں علی کی پیروی کرے گا وہ ہدایت یافتہ ہوگا اور اس پر دلیل خود قول پیغمبر ہے کہ اے خدا حق کو علی کیساتھ پلٹا دے وہ جدھر بھی پلٹیں۔"

پھر اسی سلسلہ میں فرمایا ہے :-

ان الدلائل العقلیۃ موافقۃ لنا وعمل علی ابن ابی طالب معنا ومن اتخذ علیاً اماماً لدینہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ فی دینہ ونفسہ (جلد اول صہ ۱۶۱)

بلاشبہ عقلی دلیلیں ہمارے موافق ہیں اور علی ابن ابی طالب کا عمل ہمارے ساتھ ہے اور جو علی کو اپنے دین کا پیشوا بنائے گا وہ اپنی ذات اور اپنے دین میں (اللہ کی) مضبوط رسی سے وابستہ ہوگا۔"

سیرت امیر المومنینؑ اور ان کا واجب الاتباع ہونا

ان ارشادات سے جہاں یہ واضح ہوا کہ جہر بالتسمیہ (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بلند آواز سے پڑھنا) حضرت امیر المومنین علی ابن ابیطالب علیہ السلام کا وہ معمول تھا جو بتواتر منقول ہے اور انکی صحت کی ضمانت اسکا تواتر ہے۔ وہاں یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ حدیث نبوی اللھم ادر الحق مع علی حیث دار مسلم الثبوت ہے اور وہ حضرت امیر المومنینؑ کے امام واجب الاتباع ہونے کی دلیل ہے اس کا مفاد یہ ہے کہ حضرت کی پیروی واجب اور ذریعہ ہدایت ہے۔ آپ کو امام دین قرار دینا "عروۃ الوثقیٰ" سے تمسک کرنا ہے جس نے یہ طریقہ اختیار کیا اس نے اپنی ذات اور اپنے دین کے بارے میں ایسی مضبوط رسی پکڑ لی جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں۔

علامہ رازی نے اس پرزور کلام میں ایک ایسی حقیقت مسلمہ کیطرف اسلامی دنیا کی رہنمائی کی ہے جو مذہب شیعہ امامیہ کا بنیادی نظریہ ہے۔ اگر اس سے بے اعتنائی نہ کی گئی ہوتی تو شیرازۂ اسلام نہ بکھرتا اور اسلامی دنیا میں اختلافات کے ہنگامے نہ ہوتے۔ یہ مرشدانہ کلام آج بھی ہر طالب حق و صواب کو دعوت فکر و نظر دیتا ہے۔

بسم اللہ کے متروک ہونے کا راز

علامہ رازی کے بیانوں میں اس امر کی طرف واضح اشارہ موجود ہے کہ حضرت امیر المومنین کا آیۂ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کو باواز بلند پڑھنا باوجود مشہور اور بتواتر منقول ہونے کے اسلامی دنیا میں کب سے اور کن اسباب کے تحت متروک قرار پایا۔ اور مسلمانوں کی بعض جماعتوں نے امر دین میں حضرت کی اقتدا کیوں ترک کر دی۔ تفسیر کبیر میں انس بن مالک سے چھ روایتیں نقل کی ہیں جن میں سے تین روایات جہر بالتسمیہ (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم باواز بلند پڑھنے) کے مخالف اور تین موافق ہیں۔ اس کے بعد لکھتے ہیں :-

فثبت ان الروایۃ عن انس فی ھذہ المسئلۃ قد عظم فیہا الخبط والاضطراب فبقیت متعارضۃ فوجب الرجوع الی سائر الدلائل وایضاً ففیہا

"پس ثابت ہو گیا کہ اس مسئلہ میں انس کی روایتوں میں ایک عظیم خبط و اضطراب ہے۔ اور وہ باہم دگر ٹکراتی ہیں لہٰذا دیگر دلائل کی طرف رجوع واجب ہے نیز ان میں

maablib.org

تہمة اخری وھی ان علیا کان یبالغ فی الجھر بالتسمیة فلما وصلت الدولة الی بنی امیة بالغوا فی المنع من الجھر سعیا فی ابطالِ آثار علی رضی اللہ عنہ فلعل انساً خاف منھم فلھذا السبب اضطربت اقوالہ فیہ ۔"

(جلد اول صفحہ ۱۶۰)

ایک دوسری تہمت ہے اور وہ یہ کہ علیؑ بسم اللہ کو زور سے کہنے میں بڑا اہتمام کرتے تھے پس جب حکومت بنی امیہ تک پہونچی تو انھوں نے بسم اللہ کے زور سے پڑھنے کو روکنے میں پورا اہتمام کیا (کیونکہ وہ) علی کے تمام آثار مٹانے کے درپے تھے تو شاید انس کو خوف پیدا ہوا اسی لئے بسم اللہ کو زور سے پڑھنے کے بارے میں انکی روایتوں میں اضطراب واختلاف ہے"

امام شافعی نے روایت کی ہے :-

ان معاویة قدم المدینة فصلی بھم ولم یقرأ بسم اللہ الرحمن الرحیم ولم یکبر عند الخفض الی الرکوع والسجود فلما سلم ناداہ المہاجرون والانصار یا معاویة سرقت من الصلوٰة این بسم اللہ الرحمن الرحیم واین التکبیر عند الرکوع والسجود ثم انہ اعاد الصلوٰة مع التسمیة والتکبیر (تفسیر کبیر ص۱۵۹)

معاویہ مدینہ آئے اور لوگوں کے ساتھ نماز پڑھی مگر نہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کہا اور نہ رکوع وسجود میں جاتے کے وقت تکبیر کہی۔ پس جب سلام پڑھ چکے تو مہاجرین و انصار نے اس سے پکار کے کہا کہ اے معاویہ تم نے نماز میں سرقہ کر لیا (آخر) بسم اللہ الرحمن الرحیم کہاں ہے اور رکوع وسجود والی تکبیر کہاں ہے تو معاویہ نے بسم اللہ اور تکبیر کے ساتھ دوبارہ نماز پڑھی۔"

اس روایت کے بعد امام شافعی نے فرمایا ہے :-

ان معاویة کان سلطاناً عظیم القوة شدید الشوکة فلولا ان الجھر بالتسمیہ کان الامر المتقرر عند کل الصحابة من المہاجرین والانصار لما قدروا علی اظہار الانکار علیہ بسبب ترک التسمیة (تفسیر کبیر ص۱۹۵)

"معاویہ بڑی طاقت اور رعب والے بادشاہ تھے اگر مہاجرین وانصار صحابہ کے نزدیک بسم اللہ کا بلند آواز سے پڑھنا ایک طے شدہ مسئلہ کی طرح نہ ہوتا تو لوگوں میں یہ ہمت نہ ہوتی کہ ان کے ترک بسم اللہ پر اس طرح اعتراض کرتے ۔"

جہانتک استدلال کا تعلق ہے امام شافعی کا ارشاد سراسر حق اور ایک حقیقت مسلمہ کا ترجمان ہے روایت منقولہ سے جہر بالتسمیہ کا کل صحابہ مہاجرین و انصار کے حلقوں میں ایک مسلم الثبوت امر ہونا ناقابل انکار ہے لیکن اس عبرت خیز واقعہ کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ حکومت کی عظیم طاقت اور شدید شوکت کل صحابہ کی اجتماعی صدائے انکار واجتماع پر آخرکار غالب رہی اور اہل اسلام کی بڑی جماعت نے حکومت

کا مذہب جس کی بنیاد حسب الارشاد علامہ رازی ابطالِ آثار علویہ پر تھی قبول کر لیا اور احکام وعقائد منشاء حکومت کے قالب میں ڈھل گئے اور رنگ زمانہ دیکھ کر انس بن مالک جیسے باثر و نامور صحابی کو بھی مصلحت آمیز اقرار لاعلمی کرنا پڑا۔ جب کسی نے آپ سے سوال کیا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کو باآواز بلند پڑھنا چاہیئے یا آہستہ تو آپ نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "لا ادری ھذہ المسئلة" (میں یہ مسئلہ نہیں جانتا)۔

ترک بسم اللہ کا ردعمل اسلام کو صرف اسی دور انقلاب سے اثر پذیر ہونا نہیں پڑا بلکہ اس کے بعد بھی نازک ترین انقلابی دور گذرے جو اپنے پائیدار آثار چھوڑ گئے۔ مورخ ابن اثیر تاریخ کامل میں لکھتے ہیں۔ جلد ۱۰ ص۱۱۳

وامر (المستظھر باللہ) بالجھر ببسم اللہ الرحمن الرحیم وھذا ایضاً لم تجربہ عادة وانما ترک الجھر بالتسمیة فی جوامع بغداد لان العلویین اصحاب مصر کانوا یجھرون بھا فترک ذالک مخالفة لھم لا اتباعاً لمذھب احمد الامام

اور مستظہر باللہ نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کو زور سے پڑھنے کا حکم دیا حالانکہ اس کا رواج بھی متروک ہو چکا تھا اور بغداد کی جامع مسجدوں میں بسم اللہ کا بلند آواز سے پڑھنا صرف اس لئے ترک کر دیا گیا تھا کہ علویین جو سلاطین مصر تھے وہ بسم اللہ کو بلند آواز سے پڑھتے تھے تو صرف ان کی مخالفت میں اسکو ترک کر دیا گیا۔ اس لئے نہیں کہ امام احمد کے مذہب کی پیروی مقصود رہی ہو۔"

(دوم) "بسم اللہ" میں حرف جار "ب" مدد کے معنی دیتی ہے اس کو بنا بر قاعدۂ عربیہ کسی فعل یا شبہ فعل (یعنی مصدر یا اسم فاعل وغیرہ سے متعلق ہونا چاہیئے۔ مناسب مقام یہاں فعل "ابدأُ" ہے جس کا ترجمہ اردو زبان میں "شروع کرتا ہوں" ہوگا اور حاصل معنیٔ آیت یہ ہوگا کہ میں خدا کے نام کی مدد و برکت سے اس امر کو شروع کرتا ہوں"۔ اس فعل "ابدأ" کا فاعل عبد کو مانا جائے یا خدا کو[1] بہرصورت یہ امر ظاہر ہے کہ اس انداز کلام و طرز سخن سے خدا نے بندوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ تمام امور کو ذکر الٰہی سے شروع کرنا چاہیئے۔ خدا کا نام لے کر شروع کرنا اور اسم الٰہی کو عنوان صحیفۂ عمل قرار دینا بندگی کا مناسب ترین طریقہ اور عبودیت کا موزوں ترین شعار ہے۔ اکثر حصہ قرآن مجید میں خدا کی حمد و ثنا، تقدیس و تسبیح، تمجید و تعظیم مذکور ہے اور اسکا مدعا بندگان خدا کی

---

[1] جب خدا کو قائل مانا جائے تو فعل امر بھی متعلق ہو سکتا ہے یعنی شروع کرو اللہ کے نام سے الخ ۱۲ مرتب

علمی تعلیم و ہدایت ہے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کو ہر سورہ کا عنوان قرار دینے کا مقصد بھی یہ تعلیم دینا ہے کہ ہر کام کے آغاز میں یہ خیال رکھنا شان بندگی کا تقاضا ہے کہ میں اسکو خدا ہی کی دی ہوئی قوت و استطاعت سے کرتا ہوں اور اسکا حد تمام کو پہونچنا خدا کی امداد و اعانت پر موقوف ہے۔ میں خود اپنی قوت و استطاعت کا مالک نہیں ہوں۔ بلکہ وہ خدا کی دی ہوئی ہے۔ اور وہ بھی اس وقت کام کے حد تمام تک پہونچنے کے لئے کافی ہو سکتی ہے جب کہ عنایت ربانی و توفیق سبحانی دستگیر ہو اور مدد خداوندی سہارا دے۔ حضرت امیر المومنین علی ابن ابیطالب علیہ السلام نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے۔

فیقول العبد افتتاح کل امر صغیر او عظیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ای استعین علی ھذا الامر الذی لا تحق العبادۃ لغیرہ (تفسیر برہان)

ہر چھوٹے بڑے امر کی ابتدا کرتے وقت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہو یعنی اس امر پر میں اس ہستی سے اعانت کا طالب ہوں جسکے علاوہ کوئی اور حقدار عبادت نہیں ہے

نیز اسی سلسلہ میں فرمایا ہے:۔

ایھا الفقراء الی رحمتی انی قد الزمتکم الحاجۃ الی فی کل حال و ذلۃ العبودیۃ فی کل وقت فالی فافزعوا فی کل امر تاخذون فیہ و ترجون تمامہ و بلوغ غایتہ (تفسیر برہان صفحہ ۴۲ مطبوعہ ایران)

اے میری رحمت کے محتاج لوگو! میں نے ہر حال میں تم لوگوں پر اپنی جانب احتیاج کو لازم کر دیا ہے اور بندگی کی ذلت ہر وقت تمہارے شامل حال ہے تو اس معاملے میں جسے تم کرنا چاہتے ہو اور اسکو حد تمام پر پہونچانا چاہتے ہو تو صرف میری طرف رجوع کرو۔"

حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تفسیر میں استعین علی ھذا الامر الذی لا تحق العبادۃ لغیرہ فرما کر اس امر کیطرف اشارہ فرمایا ہے کہ مدد کرنا برکت دینا خدا کی ذات مقدسہ کا کام ہے۔ اور مدد اسی سے مانگی جاتی ہے۔ اسماء الہیہ سے نہ مدد مانگی جاتی ہے اور نہ مدد کرنا ان کا کام ہے لہٰذا "خدا کے نام کی اعانت" سے مقصود درحقیقت خدا کی اعانت ہے۔ البتہ خدا کا نام خدا سے مدد مانگنے اور اعانت طلب کرنے کا ذریعہ ہے۔ جو شخص کسی کو پکارتا یا بلاتا ہے تو اسکا نام لیتا ہے اور نام کو (جو لفظ ہے اور اس شخص کی ذات کیلئے معین کیا گیا ہے) اس کو پکارنے یا بلانے کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ اصل غرض اس کی اس شخص کی ذات سے متعلق ہوا کرتی ہے جبکا وہ نام لیتا ہے اور نام اس ذات کو پہچانتے سمجھنے سمجھانے اور پکارنے کا فقط وسیلہ ہوتا ہے۔ اسماء الہیہ بھی وہ الفاظ موضوعہ ہیں جو مسمٰی یعنی ذاتِ خدا کی جانب رہنمائی اور اشارہ کرتے ہیں اور اسی ضرورت سے

وضع کئے گئے ہیں کہ بغیر ان کے ذاتِ خدا کا عرفان ممکن نہ تھا۔ اسی لئے کہا گیا ہے لولا الاسم لما عرف المسمی (اگر نام نہ ہوتا تو نام والا نہ پہچانا جاتا۔) حدیث میں ہے:۔

فلیس یحتاج ان یسمی لنفسہ ولکنہ اختار لنفسہ اسماء لغیرہ یدعوہ بھا لانہ اذا لم یدع باسمہ لم یعرف۔ (اصول کافی)

خدا کو ضرورت نہ تھی کہ وہ اپنا نام رکھتا لیکن دوسروں کے لئے اس نے اپنے کچھ نام منتخب کر لئے ہیں تاکہ وہ لوگ انھیں ناموں سے اسے پکاریں۔ کیونکہ جب تک اس کے نام سے اسکو پکارا نہ جائیگا اسکی معرفت نہ حاصل ہوگی۔"

خدا سے مدد چاہنے اور پناہ مانگنے میں اس کے اسماء کو وسیلہ قرار دینا اس حکم الٰہی کا اتباع ہے وللہ الاسماء الحسنیٰ فادعوہ بھا اسماء حسنیٰ صرف خدا ہی کے لئے ہیں پس انھیں کے ذریعہ سے تم اسکو پکارو۔ اور جناب رسالتمآب کے اس ارشاد کی پیروی ہے:۔ اعوذ باسمائک الحسنیٰ میں تیرے اسماء حسنیٰ کے وسیلہ سے پناہ مانگتا ہوں۔

اسلام کا نظریہ یکجہتی اگر صرف یہ حکم دیا جاتا کہ خدا کی حمد و ثنا اور تقدیس و تسبیح کرو اور اسکا واضح طریقہ معین الفاظ میں نہ بتایا ہوتا تو مختلف افراد اس حکم کی بجا آوری کے لئے مختلف طریقہ اور الگ الگ الفاظ اختیار کرتے جن میں سے ایسے بھی ہوتے جو شان ربوبیت و الوہیت کیلئے موزوں و مناسب نہ ہوتے۔ انسانی افراد اور جماعتوں میں تحمید و تسبیح کے بارے میں اختلاف و انتشار رہتا یکرنگی و یکجہتی مفقود ہوتی اس لئے محض حکم دینے پر اکتفا نہیں کی گئی۔ بلکہ معین الفاظ و عبارات میں اسکی عملی تعلیم دی گئی۔ انسان کے معاشرتی امور میں اس طریقہ عملی تعلیم کی مثال موجود ہے۔ اور اگر ایک دوسرے کو سلام کرنے کا حکم دے کر کوئی واضح طریقہ معین نہ کر دیا جاتا تو سلام کے طریقے اور الفاظ میں اختلاف ہوتے اور بعض نہایت غیر مناسب اور ناموزوں ہوتے۔ سلام کے غیر اسلامی طریقے زمانہ حاضر میں بھی اسکا ثبوت دیتے ہیں لہٰذا خداوند عالم کیطرف سے یہ نہیں کہا گیا کہ "تم ایک دوسرے کو سلام کرو" بلکہ "فقل سلام علیکم" ارشاد ہوا۔ یعنی کہو سلام علیکم اس طرح اسلام کے لئے موزوں انداز اور مناسب ترکیب کا تعین کر دیا گیا۔ تاکہ نہ صرف غیر مناسب طریقوں سے بلکہ اختلاف و رنگا رنگی کے عیب سے بچا لیا جائے۔

آیۂ کریمہ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کا سورہ کی ابتدا میں ہونا عملی تعلیم و ہدایت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ مشرکین عرب اپنے کاموں کو باللات والعزیٰ کہہ کر شروع کیا کرتے تھے۔ دیوی دیوتاؤں اور بزرگانِ

maablib.org

قوم کے ناموں سے کام شروع کرنے اور مدد چاہنے کی مثالیں غیر اسلامی افراد اور جماعتوں کی طرف سے روزمرہ ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔ تعلیم خداوندی نے ان تمام مشرکانہ طریقوں کا انسداد کرنے کیلئے یہ تعلیم دی کہ :- "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کہہ کر اپنے امور کی ابتدا کیا کرو۔"

اس لحاظ سے ان مفسرین کا قول صحت وصواب اور مناسبت مقام سے قریب ہے جو کہ یہ کہتے ہیں کہ ابدأ بعد بسم اللہ کے مقدر ہے۔ کیونکہ حسب قاعدہ زبان عرب یہ ترکیب کلام اختصاص کے معنی پیدا کرتی ہے اور اس ذکر الٰہی کی اہمیت ظاہر کرتی ہے۔ (فن بلاغت کے ماہرین نے اس کی تصریح کی ہے کہ کسی چیز کا مقدم رکھا جانا اسکی اہمیت کو ظاہر کرتا اور یہ بتاتا ہے کہ اسکا تذکرہ متکلم کا مقصد اصلی ہے) اور اس صورت میں حاصل آیت یہ ہوگا کہ میں معبود برحق ہی کے نام سے شروع کرتا ہوں۔" اسی طرح قول خداوندی "بسم اللہ مجریہا" میں بھی "بسم اللہ" کو مقدم اور اسکے متعلق "مجریہا" کو موخر قرار دیکر اختصاص کے معنی پیدا کئے گئے ہیں۔ اور ذکر خدا کی اہمیت وعظمت ظاہر کی گئی ہے۔

ارشاد ربانی "اقرأ باسم ربک" میں یہ طرز کلام اختیار نہیں کیا گیا۔ کیونکہ اس موقع پر خدا کے نام سے ابتدا کرنے کی ہدایت مقصد اہم نہ تھی بلکہ اصل مدعا اور مقصد اہم کتاب خدا پڑھنے اور بندگان خدا تک وحی قرآنی کو پہنچانے کا حکم تھا۔ سلسلہ وحی کا آغاز تھا اس وقت اصل غرض قرأت قرآن اور اسکی تبلیغ کے حکم سے متعلق تھی۔

ہر کام میں بسم اللہ کی اہمیت مختصر یہ کہ آیہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں مشرکانہ خیالات ملحدانہ جذبات اور استقلال خودی کے پر غرور احساسات کا خاتمہ کر کے خالص خدا پرستی کے جذبات کو ابھارنے کے لئے جو عملی تعلیم وہدایت دی گئی ہے۔ وہ باوجود کمال اختصار نہایت وسیع اور جامع ہے اور اسی لئے اس آیت کو خاص اہمیت حاصل ہے اگرچہ انسان اپنے امور کی ابتدا خدا کے کسی نام سے کرے وہ حصول برکت اور اظہار شان عبودیت کیلئے کافی ہوگا مگر احادیث یہ ظاہر کرتی ہیں کہ اس آیت کو خاص عظمت واہمیت ہے اور ہر کام کو اس عبارت "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" سے شروع کرنا ہدایت ربانی کا اہم مقصود ومطلوب ہے۔"

چند احادیث مندرج ذیل ہیں :-

(۱) ارشاد نبوی ہے :-

اذا قال معلم للصبی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کتب لہ براۃ للصبی وبراۃ لابویہ وبراۃ للمعلم۔"

جب معلم بچے کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تعلیم دیتا ہے تو خداوند کریم بچے اور اس کے والدین اور خود معلم کیلئے ایک برأۃ نامہ تحریر کر دیتا ہے

(۲) حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے :-

ان العبد اذا اراد ان یقرأ او یعمل عملا فیقول بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ای بھذا الاسم اعمل ھذا العمل فکل عمل یعملہ یبدأ فیہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم فانہ مبارک لہ فیہ (تفسیر برہان ص۲۹)

جب بندہ قرأت یا کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہے۔ یعنی اس نام کے وسیلہ سے میں یہ کام کرتا ہوں۔ اس لئے کہ ہر وہ عمل جس میں بسم اللہ سے ابتدا ہو، مبارک ہوگا۔

(۳) نیز حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے :-

فقولوا عند افتتاح کل امر صغیر وعظیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (تفسیر برہان ص۲۹)

ہر چھوٹے اور بڑے امر کے شروع کرنے کے وقت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہو۔"

(۴) حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا :-

ربما ترک فی افتتاح امر بعض شیعتنا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم فیمتحنہ اللہ بمکروہ لینبھہ اللہ علی شکر اللہ والثناء علیہ ویمحو عنہ وصمۃ تقصیرہ عند ترکہ قول بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

کسی امر کی ابتدا کرنے میں بسم اللہ کہنا بسا اوقات ہمارے بعض شیعہ ترک کر دیتے ہیں تو خدا ان کو کسی امر مکروہ میں مبتلا کر کے امتحان لے لیتا ہے کہ خدا کے شکر وثنا کی اسے تنبیہ ہو جائے اور بسم اللہ ترک کر دینے کی کوتاہی کا عیب اس سے محو ہو جائے۔"

(۵) حضرت امام علیؑ رضا نے فرمایا :-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اقرب الی اسم اللہ الاعظم من سواد العین الی بیاضھا۔" (تفسیر برہان)

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم خدا کے اسم اعظم سے اس سے زیادہ قریب ہے جتنا کہ آنکھ کی سیاہی اس کی سفیدی سے قریب ہے۔"

اَللّٰہ خدا کی ذات مجردہ (یعنی تمام صفتوں، نسبتوں اور اضافتوں سے الگ کر کے خالص ذات) کا تصور نہ فقط انسان کے لئے بلکہ جمیع خلائق کے لئے ناممکن ہے۔ ذات مجردہ تصور ووہم وخیال سے بالاتر ہے لہذا اس اعتبار سے اس کا کوئی نام نہیں ہو سکتا۔ اور نام رکھنے کی کوشش محض لاحاصل وبے ثمر ہوگی کیونکہ نام ایک لفظ ہوتا ہے جس کی وضع اس معنی کے لئے ہوتی ہے جو صورت ذہنیہ بنکر ظرف ذہن وعقل میں آ سکتا ہے۔ احاطہ تصور وتعقل میں جس کے لئے جگہ پیدا ہو سکتی ہے اور وضع اسم کی غرض یہ ہوا کرتی ہے کہ بوقت ضرورت اس کو بول کر اس کے مسمی کا تصور پیدا کرا دیا جائے۔ لہذا جس ذات مقدسہ کی کوئی صورت ذہنیہ قائم نہ ہو سکتی ہو جس کا حدود تعقل اور صورت میں محدود ومحصور ہونا

غیر ممکن ہو اس کے لئے کسی نام کے وضع کئے جانے کا غیر معقول اور بے فائدہ ہونا ایک کھلی ہوئی بات ہے اس سے ظاہر ہوا کہ یہ خیال درست نہیں کہ "اللہ" اس ذات مجردہ الٰہیہ کا نام ہے جس سے تمام صفات و اعتبارات و اضافات، کو الگ کر لیا گیا ہو اور یہ اسم کسی معنی وصفی کو ظاہر نہیں کرتا۔ علامہ ابو الفتح کراجکی کا یہ قول بالکل درست ہے کہ "پروردگار عالم کے کل ناموں کی رجوع صفت کی طرف ہوتی ہے ان میں سے کوئی ایسا نہیں جو معنی وصفی سے خالی ہو۔" (کنز الفوائد صفحہ ۲)

نوعِ انسانی کو خدا کا تصور صرف موجود حقیقی واجب الوجود علۃ عالم ہونے اور ان اوصاف و افعال کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے جن کے مظاہر کائنات عالم ہیں۔ نفوس انسانی اور آفاق عالم میں جنکا ظہور ہے۔ نیز ان نسب و اضافات۔ روابط و تعلقات کے ذریعہ سے جو خالق و مخلوق علۃ و معلول۔ رب و مربوب کے درمیان قائم ہوتے ہیں جو صفات الٰہیہ تصور میں آ سکتے ہیں ان کے اعتبار سے ایک ایک اسم خداوند عالم نے نوع انسانی کے لئے وضع فرمایا ہے اور ان اسماء کو "اسمائے حسنیٰ" سے تعبیر کرتے ہوئے فرمایا ہے" وَلِلّٰہِ الاسمآءِ الحسنیٰ فادعوہ بھا" رب، رحمان، رحیم، علیم، قدیر وغیرہ اسماء الٰہیہ خدا کا تصور الگ الگ صفتوں کے ساتھ انسانی ذہنوں میں پیدا کرتے ہیں اور یہ تصور فقط ایک خاص صفت اور خاص نسبت و تعلق کے اندر محدود و منحصر ہوتا ہے یعنی ایسی ہستی جس میں ربوبیت۔ رحمت۔ علم قدرت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا ایک ایسے نام کی ضرورت تھی جو اس اعلیٰ اور حاوی کل تصور کے مقابل میں وضع کیا گیا ہو۔ جس میں تمام تصور میں آنے والے صفات جمال و جلال جمع ہوں۔ وہ کسی خاص صفت کا تصور نہ پیدا کرتا ہو۔ بلکہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہو کہ خدا کی ذات مقدسہ وجود حقیقی اور تمام حسن و کمال و جلال و جمال کی جامع ہے اور ان اوصاف کا سرچشمہ ہے جو شان الوہیت سے مناسبت رکھتے ہیں اور جو خدا کی ذات میں ہونے چاہئیں۔

اسی برترین اور حاوی کل تصور کے مقابلہ میں اسم "اللہ" موضوع ہوا ہے۔ جناب عمادالدین سرسی نے کتاب عماد الاسلام میں فرمایا ہے :-

قال الشہید اللہ اسم للذات تجری النعوت علیہ وقیل ھو اسم للذات معجملۃ الصفات الالٰھیۃ فاذا قلنا اللہ فمعناہ الذات الموصوفۃ بالصفات الخاصۃ وھی صفات الکمال و نعوت الجلال۔

شہید نے فرمایا ہے کہ اللہ وہ اسم ذات ہے جس پر تمام صفات جاری ہوتے ہیں اور کہا گیا ہے کہ اللہ جملہ صفات الٰہیہ سمیت اسم ذات ہے تو جب ہم اللہ کہتے ہیں تو اس کے معنی وہ ذات ہے۔ جو صفات خاصہ (صفات جلالیہ و کمالیہ) کیساتھ موصوف ہے۔"

اسی جامعیت اور حاوی کل صفات جمال و کمال ہونے کی وجہ سے اس اسم "اللہ" کو حضرت امیر المومنین نے "اعظم اسماء الٰہیہ" فرمایا ہے :-

ان رجلا قام الیہ فقال یا امیر المومنین اخبرنی عن بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ما معناہ فقال ان قولک اللہ اعظم اسم من اسماء اللہ عزوجل وھو الاسم الذی لا ینبغی ان یسمیٰ بہ غیر اللہ ولم یتسم بہ مخلوق۔ فقال الرجل فما تفسیر قول اللہ قال ھو الذی یتالہ الیہ عند الحوائج والشدائد کل مخلوق عند انقطاع الرجاء من جمیع من دونہ وتقطع الاسباب من کل ما سواہ۔

(تفسیر برھان)

ایک شخص حضرت کے سامنے استادہ ہوا اور کہا کہ اے امیر المومنین آگاہ فرمائیے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے کیا معنی ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ تیرا قول "اللہ" خدا کا اسم اعظم ہے اور یہ وہ نام ہے کہ سزاوار نہیں ہے کہ غیر خدا کو یہ نام دیا جائے اور (پہلے بھی) کسی مخلوق کا یہ نام نہیں پڑا۔ تو اس نے کہا کہ پھر اللہ کی تفسیر کیا ہوگی۔ فرمایا کہ وہ ایسی ہستی ہے کہ اپنی ضرورتوں اور سختیوں کے وقت جب اس کی سب سے امیدیں اور ذریعے منقطع ہو چکے ہوتے ہیں۔ پناہ لیجاتی ہے

(تفسیر برہان)

اللہ کا مفہوم | حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے اس ارشاد سے ظاہر ہوتا ہے کہ لفظ "اللہ" بنایا گیا ہے "اَلَہَ" سے۔ جس کے معنی "پناہ لی" ہیں۔

تفسیر مجمع البیان میں ہے ۔ ومنھا انہ مشتق من قولھم الھت الیٰ فلان ای فزعت الیہ لان الخلق یالھون الیہ ای یفزعون الیہ فی حوائجھم فقیل للمالوہ الہ "کما یقال للموتم بہ امام یعنی لفظ اللہ عرب کے قول "الھت الیٰ فلان" سے مشتق ہے یعنی فلاں کی طرف میں نے پناہ لی۔ اس لئے کہ تمام مخلوق اپنی ضرورتوں میں خدا کی طرف رجوع کرتی ہے چنانچہ کہا گیا ہے کہ پناہ گیر کیلئے ایک پناہ دہندہ ہوتا ہے جیسے کہ ماموم کیلئے ایک امام ہوتا ہے۔"

اور جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے :-

"اللہ" مشتق من الہ والالہ یقتضی مالوھا لفظ اللہ "اَلَہ" سے مشتق ہے یعنی عبادت کیا اِلٰہ کیلئے مالوہ کا ہونا ضروری ہے۔

حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا وہ ارشاد اوپر نقل کیا گیا جس میں حضرت نے اللہ کی تفسیر میں فرمایا ہے الذی لا یحق العبادۃ لغیرہ یعنی وہ ہستی جس کے سوا کوئی مستحق عبادت و سزاوار پرستش نہیں۔"

اِس تفسیر سے بھی جناب امام جعفر صادق علیہ السلام کے ارشاد کی تائید ہوتی ہے۔ اس ارشاد صادق میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ لفظ "اللہ" کا جوہر و مادہ الف۔ لام۔ ہ ہے جس سے معنیٰ معبودیت کا تصور وابستہ ہے۔ یہ لفظ اپنے جوہر و مادہ ہی کے اعتبار سے ایک بلند ترین قابلِ پرستش ہستی کے وجود کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جس کے تصور سے انسانی اذہان کسی زمان و مکان میں خالی نہیں ہیں۔

اگر فی الجملہ غور و فکر سے کام لیا جائے تو اس امر کا انکشاف کچھ مشکل نہیں کہ لفظ "اللہ" کے متعلق یہ دونوں تفسیریں کوئی حقیقی اختلاف نہیں رکھتیں اور ہستی خدا کی دو ایسی خصوصیتوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں جنکا وجدانی احساس فطرت انسانی میں موجود ہے۔ انسانی ذہن فطری ہدایات اور قلبی دلائل کے دباؤ سے ایک ایسی ارفع و اعلیٰ ہستی اور مافوق خلائق و کائنات ذات کے باوجود کے احساس سے کبھی خالی نہیں رہا جو بلند ترین قوتوں کی مالک اور سب کی پیدا کرنے والی ہے۔ مصیبتوں اور بلاؤں کے اس نازک وقت میں جب کوئی سہارا نہ ہو اور دست تدبیر ہر طرح کے وسائل و اسباب سے کوتاہ ہو چکا ہو۔ پناہ دینے، فریاد سننے اور بچا لینے پر قادر ہے اور معبودانہ صفات کی جلوہ گری اسے اسکی مستحق ظاہر کرتی ہے کہ اسکی عبادت کی جائے اور سر بندگی اس کے سامنے جھکایا جائے۔

معصومین کے مندرجہ بالا کلاموں میں ذاتِ الٰہیہ کی انھیں دونوں خصوصیتوں کیطرف اشارہ کیا گیا ہے جس کا احساس فطرت انسانی کا پیدا کردہ ہے اور "الٰہ" کے مندرجہ بالا معنوں میں سے جس معنیٰ کو بھی چشم بصیرت و عقل کے سامنے لایا جائے لفظ اللہ کا اس سے مشتق ہونا انسان کے فطری احساسات سے قریب تر ہوگا اور نوعِ بشر کی فطرت صالحہ اس پر شاہد و حاکم ہوگی۔

اللہ کی وصفی حیثیت خلاصہ یہ ہے کہ لفظ اللہ دراصل وصف ہے اور معنیٰ وصفی رکھتا ہے مگر کسی خاص وصف کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ اس کی وضع نہایت وسیع۔ جامع اور حاوی کل معنیٰ وصفی کے لئے قرار دی گئی ہے۔ جب ہم لفظ اللہ بولتے یا سنتے ہیں تو ہمارا ذہن ایک ایسی ذات کی طرف منتقل ہوتا ہے جو موجود حقیقی واجب الوجود خدائی شان کے مناسب کمالات کی جامع اور جملہ صفات کمال و جمال و جلال سے متصف ہے اور "الف و لام" اس لفظ کی ابتدا میں اظہار عظمت و جلالت کی غرض سے ہے۔

علامہ طبرسی تفسیر مجمع البیان میں کہتے ہیں:-

انما ادخلت علیہ الالف واللام للتفخیم — لفظ "اللہ" میں الف و لام صرف عظمت و بزرگی کے لئے
والتعظیم فقط ومن زعم انہ للتعریف — ہے اور جس نے یہ خیال کیا ہے کہ تعریف کے لئے ہے

فقد اخطاء لان اسماء اللہ تعالیٰ معارف — اس نے غلطی کی اسلئے کہ اسمائے خدا پہلے ہی سے معرفہ ہیں۔

عقل کی فطرت سلیمہ شاہد ہے کہ جب کسی ذات کا یہ اعلیٰ و ارفع تصور ذہن میں جگہ پائے گا تو اس کے ساتھ اسکی دو خصوصیتیں بھی تصور میں ضرور آئیں گی۔

(اول) یہ کہ وہ ذات یکتا و یگانہ، شریک و مثل و نظیر سے منزہ ہے اس جیسا کوئی دوسرا موجود نہیں لہٰذا لفظ "اللہ" باوجود اپنے معنی وصفی کے بطور اسم ذات اور بمنزلہ علم ذات کے مستعمل ہے اور جیسا کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا یہ نام خدا کے سوا کسی کے لئے زیبا و سزاوار نہیں اور کبھی کسی مخلوق کا نام "اللہ" سے نہیں رکھا گیا۔ اس بنا پر یہ اسم "اللہ" جہاں اپنے مسمیٰ یعنی خدا کا موجود حقیقی وجامع کمالات الٰہیہ ہونا ظاہر کرتا ہے۔ وہاں مفید توحید بھی ہے یعنی اس امر کی جانب بھی اشارہ کرتا ہے کہ خدا واحد و یکتا شریک و سہیم۔ مثل و نظیر سے مبرا ہے اور اسی وجہ سے وحی ربانی نے شہادت وحدانیت و اقرار توحید کے لئے کلمہ لا الٰہ الا اللہ منتخب کیا۔

تھوڑے غور اور فکر سے یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ لفظ "اللہ" اپنے مصداق و مسمیٰ کی وحدت کی دلیل اپنے اندر رکھتی ہے کیونکہ عقل گواہ ہے کہ تمام صفات کمال کی جامع ذات فقط ایک ہی ہو سکتی ہے اگر دو ذاتیں ہوں گی تو ہر ایک کے اندر کوئی ایسی خاص صفت ضرور پائی جائے گی جو دوسرے میں نہ ہوگی۔ اور اسکو دوسرے سے الگ کرتی ہوگی۔ بغیر کسی وجہ امتیاز کے دوئی اور تعدد کا تصور ہی ذہن انسانی میں نہیں آسکتا۔ اور ظاہر ہے کہ وہ صفتِ خاصہ صفتِ کمال ہی ہو سکتی ہے۔ صفتِ نقص و عیب نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ بات شان خدائی کے خلاف ہے لہٰذا ان میں سے ہر ذات کے اندر ایک ایسی صفت کمال موجود ٹھہری جس سے دوسری ذات محروم ہے اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ کوئی بھی تمام صفات کمال کی جامع نہ ٹھہرے گی۔ بلکہ ہر ذات ایک ایسے کمال سے بے بہرہ ہوگی جو دوسری ذات میں پایا جاتا ہے اور اس وجہ سے لفظ "اللہ" کی مصداق اور مسمیٰ قرار نہ پا سکے گی۔ کیونکہ یہ پہلے ہی تسلیم کر لیا گیا ہے کہ یہ لفظ اس ذات کیلئے بنائی گئی ہے جو ہر حسن و کمال اپنے اندر رکھتی ہے

(دوم) یہ کہ وہ ذات استحقاق عبادت میں یگانہ و یکتا ہے اسکے سوا کوئی حقدار عبادت نہیں اسی وجہ سے کلام خدا میں اکثر لفظ "اللہ" سے معبود برحق و مستحق عبادت و بندگی مراد ہوتا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات میں ہے۔

(۱) هو الله فی السموٰت وفی الارض (انعام) — وہی اللہ معبود ہے آسمانوں میں اور زمین میں۔
(۲) وهو الله لا اله الا هو (قصص) — وہی اللہ معبود ہے کوئی معبود اس کے سوا نہیں ہے۔

خدا کا بلا شرکت غیرے مستحق عبادت و بندگی ہونا ازلی صفت ہے۔ وہ معبود و مسجود تو اس وقت ہوا جبکہ کائنات کا وجود ہوا اور عبادت کرنے والے پیدا ہوئے مگر لائق پرستش و مستحق عبادت وہ اس وقت بھی تھا جبکہ کسی بندۂ خدا کا وجود نہ تھا۔ اور عبادت و بندگی کا مفہوم غیب علم سے عالم شہود میں نہیں آیا تھا۔

ارشاد معصوم کان الھا اذ لا مالوہ (مجمع البحرین) وہ اسوقت بھی الہ (مستحق عبادت) تھا جب کہ کوئی عبادت گزار نہ تھا) میں اسی حقیقت کا تذکرہ ہے۔

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ خدا کے ان دونوں ناموں کے متعلق چند باتوں کا تذکرہ ضروری ہے

(۱) کمالات الوہیۃ، جمال و کمال، کی جامعیت اور استحقاق معبودیت کیطرف اسم جلالہ "اللّٰہ" سے اشارہ کرنے کے بعد بندوں سے اپنا تعارف کرانے کیلئے صفت "رحمت" کا انتخاب فرمایا۔ جو اس کے ارشاد "رحمتی وسعت کل شیٔ" کے بموجب سب سے زیادہ عام و سیع۔ حاوی کل صفت ہے۔ آفاق عالم میں ہر طرف رحمت کی نمود ہے۔ ہر چیز رحمت کی جلوہ گاہ اور اسکے آثار مظہر ہے۔ "رحمت" ہی ہر شئے کا مبدأ وجود و منشا تربیت ہے وہی ہر چیز کو ہستی میں لاتی اور اسکی تربیت کے اسباب مہیا کرتی ہے اور اس نے کتب ربکم علیٰ نفسہ الرحمۃ سے یہ اعلان عام کر دیا کہ خدائی افعال و احکام کی بنیاد "رحمت" ہے اس نے "رحمت" کو خود اپنی مرضی سے اپنے اوپر واجب و لازم قرار دے لیا ہے، "رحمت" ہی وہ محور ہے جس پر اس کی قدرت و مشیت گردش کرتی ہے۔ اسکا ہر فعل اور ہر حکم "رحمت" ہی کا تقاضا ہے

قرآن میں رحمت خدا کا تذکرہ (۲) قرآن مجید میں صفت "رحمت" کا تذکرہ اس کثرت سے کیا گیا ہے کہ اسکا حصر و شمار دشوار ہے "وربک الغنی ذو الرحمۃ" اور کہیں ارشاد ہوا ہے۔ فقل "ربکم ذو رحمۃ واسعۃ" اور "رحمت" ہی کو فضل۔ رافت۔ محبت لطف اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ میں بھی بے شمار آیات میں ذکر فرمایا ہے۔ اور ہر سورہ کی ابتدا "رحمان و رحیم" سے قرار دینا اور اس طرح تذکرہ "رحمت" بار بار دہرانا ہر مرد عاقل کو یہ سمجھاتا ہے کہ مقصود خداوندی صفت "رحمت" کو سامنے لانا ہے اور مکمل طور سے یہ واضح کر دینا کہ قرآن جس خدا کی طرف دعوت دیتا ہے اور جسکی معرفت پیدا کراتا ہے اسکا مقصد حقیقی رحمت ہے وہ محبت اور رحمت کا خدا ہے۔ لہٰذا مخالفین اسلام کا یہ اتہام کہ قرآن کا خدا ایک جبار و قہار غضب ناک و خوگر عذاب و عقاب خدا ہے یا تو انکی حد درجہ لاعلمی کا نتیجہ ہے یا کھلی ہوئی ہٹ دھرمی

حقیقت رحمت (۳) جناب غفرآنماب تحریر فرماتے ہیں کہ:-

لیست الرحمۃ عبادۃ عن رقۃ القلب والشفقۃ وانما ھی عبادۃ عن الفضل والانعام وضروب الاحسان فالحد الشامل ان یقال رحمۃ التخلیص من اقسام الآفات وارسال الخیرات الیٰ ارباب الحاجات۔

رحمت دل کی ہمدردی اور نرمی کا نام نہیں ہے بلکہ رحمت فقط فضل و انعام اور مختلف طرح کے احسان کو کہتے ہیں۔ تو رحمت کی پوری تعریف یہ ہوئی کہ ہر طرح کی آفت سے بچا لینا اور صاحبان ضرورت تک بھلائیوں کو پہنچا دینا

(عماد الاسلام کتاب التوحید صفحہ ۱)

لہٰذا رحمت کے لئے قلب یا رقت قلب کا ہونا ضروری نہیں ہے تاکہ خدا کی ذات پر اسکا اطلاق قابل اعتراض قرار دیا جا سکے۔ اس مطلب کی طرف جناب امیر المومنین کا یہ جملہ اشارہ کرتا ہے کہ رحیم لا یوصف بالرقۃ (وہ ایسا رحیم ہے جسکا وصف رقت اور نرم دلی سے نہیں کیا جا سکتا۔

(نہج البلاغۃ)

رحمٰن و رحیم کا فرق (۴) کسی کو اس وہم میں نہ مبتلا ہونا چاہیئے کہ رحمٰن و رحیم بالکل مرادف اور ہم معنی لفظیں ہیں۔ ایک متکلم حکیم اگر بظاہر مرادف لفظیں بھی کسی ایک مقام پر استعمال کرتا ہے تو بھی ان میں کوئی معنوی لطافت کا خیال ضرور رکھتا ہے۔ علم معانی کا مسلم قاعدۂ تاسیس اسی پر مبنی ہے۔ چنانچہ اہل علم نے بلکہ خود ائمہ معصومین نے رحمٰن و رحیم کے فرق کو بیان فرمایا ہے۔ الرحمٰن قال ابن فہد بجمیع خلقہ الخ یعنی وہ تمام مخلوقات پر رحمٰن ہے بایں معنی کہ ان سب کو رزق دیتا ہے اور اسباب معاش مہیا کرتا ہے خواہ وہ مومن ہوں یا کافر، نیکوکار ہوں یا بدکار۔ الرحیم دوام اسجایا یعنی خصائل حمیدہ کی ابدیت کا مظہر اور یہ مومنین کے لئے خاص ہے (آلاء الرحمٰن)

وجہ تخصیص رحیم ارشاد امیر المومنین ہے کہ الرحیم بنا فی ادیاننا یعنی دینی امور میں وہ ہم پر رحم کرنیوالا ہے۔ بظاہر یہ تخصیص اس لئے ہے کہ کافر دین سے نفع نہیں اٹھاتا ہے۔

صاحب مجمع البیان تحریر فرماتے ہیں:-

وجہ عموم الرحمٰن بجمیع الخلق مومنھم وکافرھم وبرھم وفاجرھم ھو انشاءہ ایاھم وخلقھم احیاءً قادرین ورزقھم ایاھم ووجہ خصوص الرحیم

صفت رحمٰن کی وجہ عمومیت تمام مخلوقات مومن کافر اور نیک و بد کے لئے یہ ہے کہ اس نے ان کو باحیات و بااختیار پیدا اور رزق عطا کیا۔ اور صفت رحیم کی وجہ

maablib.org

بالمومنین هو ما نفعله بهم فی الدنیا من التوفیق وفی الاخرة من الجنة والاکرام وغفران الذنوب والاثام والی هذا المعنی یادل ما روی عن الصادقؑ انه قال الرحمٰن اسم خاص بصفة عامة والرحیم اسم عام بصفة خاصة۔

خصوصیت مومنین کے ساتھ یہ ہے کہ اس نے دنیا میں توفیق عبادت و طاعت عطا کی اور آخرت میں گناہ و معصیت بخش کر جنت اور برتری مرحمت کی اور اسی معنی کی طرف امام جعفر صادقؑ کا یہ ارشاد ہے کہ رحمٰن اسکا مخصوص نام ہے مگر اسکی صفتی حیثیت عام ہے یعنی یہ مومن و کافر سبکو گھیرے ہوئے ہے اور رحیم اسکا اسم عام ہے مگر اسکی صفتی حیثیت خاص ہے یعنی صرف مومنین کے حال پر۔"

لغت و قرآن سے اس فرق کی تائید

منجد میں ہے کہ الرحمٰن من الاسماء الحسنیٰ مختص بہٖ یعنی رحمٰن خدا کے اسمائے حسنہ میں سے ہے اور اس کی ذات کے لئے مخصوص ہے اور مجمع البحرین میں ہے کہ الرحمٰن ھو ذوالرحمة ولا یوصف بہ غیر اللہ یعنی رحمٰن کے معنی صاحب رحمت کے ہیں اور بجز خدا کے اس لفظ سے کسی کا وصف نہیں کیا جاتا اور رحیم کے خصوصی معنی کے لئے تو ارشاد ربانی پر نظر کر لینا کافی ہے وکان بالمومنین رحیما یعنی خدا صرف مومنین کے لئے رحیم ہے (حصر کا فائدہ تقدیم ظرف سے نکلتا ہے)

وجہ تقدیم رحمٰن

انما قدم الرحمٰن علی الرحیم لان الرحمٰن بمنزلة اسم العلم من حیث لا یوصف به الا الله فوجب لذلك تقدیمه بخلاف الرحیم فانه یطلق علیه وعلی غیره (مجمع البیان)

رحمٰن رحیم پر اس لئے مقدم ہے کہ رحمٰن بمنزلہ اسم علم (شخصی نام) ہے اس لئے کہ بجز اس کے اور کسی کا وصف رحمٰن سے نہیں کیا جا سکتا۔ بنابریں اس کو مقدم کرنا واجب ہے۔ بخلاف رحیم کے اس سے خدا اور غیر خدا دونوں کا وصف کیا جاتا ہے۔"

ایک دوسری وجہ تقدیم

ان لفظ الرحمٰن یدل علی من تصدر عنه آثار الرحمة بالفعل وهی افاضة النعم والاحسان ولفظ الرحیم یدل علی منشا هذه الرحمة والاحسان وعلی انها من الصفات الثابتة الواجبة کالاخلاق والسجایا فی الناس علیم وحکیم وحلیم وجمیل فاذا سمع العرب وصف الله جل شانه بالرحمٰن فهم انه المفیض بالنعم

لفظ رحمٰن اس ہستی کو بتاتی ہے جس سے بالفعل آثار رحمت ظہور پذیر ہیں اور وہ نعمات اور احسان کا اس وقت سب لوگوں تک پہونچانا ہے اور لفظ رحیم اس ذات کو بتاتی ہے جو اس رحمت و احسان کا منشا ہے۔ نیز یہ بتاتی ہے کہ رحیمیت وہ صفت ہے جو دائم الثبوت ہے بالکل اسی طرح جیسے خصائل و اخلاق انسانی پائدار ہوتے ہیں (اس مطلب کے سمجھنے کے لئے ایک واضح تقریر کی ہے کہ) ایک عرب جس وقت اللہ کے لئے وصف رحمٰن کو

فعلا فلا یعتقد منه ان الرحمة من الصفات الواجبة دائما لان الفعل قد ینقطع اذ لم یکن عن صفة لازمة ثابتة وان کان کثیرا فعند ما یسمع لفظ الرحیم یکمل اعتقاده علی الوجه الذی یلیق بالله ثم یعلم ان لله صفة ثابتة هی صفة الرحمة التی عنها یکون اثرها ویکون ذکرها بعد الرحمٰن کذکر الدلیل بعد المدلول لیقوم برهانا علیه (آلاء الرحمٰن)

سنتا ہے تو یہ سمجھتا ہے کہ خدا بالفعل بخشندہ نعمات ہے مگر یہ عقیدہ نہیں پیدا کر سکتا کہ اس کی یہ بخشش دائمی ہے کیونکہ فعل و اثر کبھی کبھی ختم ہو جاتے ہیں جبکہ ان کا ربط کسی وصف دائمی سے نہیں ہوتا۔ لیکن جب رحمٰن کے بعد وہ عرب رحیم کی صفت کو سنتا ہے تو اسکا عقیدہ اس حد پر کامل ہو جاتا ہے جو شایان خدا ہے یعنی وہ سمجھ لیتا ہے کہ صفت رحمت خدا کے لئے دائم الثبوت ہے اور اسی کے آثار کہ جو اسوقت ظاہر ہیں تو رحیم کا بعد رحمٰن کے مذکور ہونا ایسا ہی ہے جیسے کسی دلیل کو مدلول کے بعد ذکر کیا جائے تاکہ برہان کی حیثیت اختیار کرے۔"

ایک تیسری وجہ تقدیم

رحمت دنیا کے وہ نتائج خواہ کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں فانی اور بے ثبات ہونے کی وجہ سے رحمت آخرت کے نتائج کے برابر نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ وہ باقی اور ابدی ہیں۔ لہٰذا معنیٰ کے اعتبار سے لفظ رحیم کو لفظ رحمٰن پر شرف و فضیلت حاصل ہے۔ بنابریں رحیم کی لفظ کا بعد میں ہونا ضروری ہے تاکہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی ہو جو مقتضائے بلاغت ہے۔ لہٰذا یہ اعتراض صحیح نہیں کہ "اس آیت میں اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف الٹی ترقی کی گئی ہے۔ اگر بسم اللہ الرحیم الرحمٰن کہا جاتا تو بلاغت کے اعتبار سے درست ہوتا۔"

خلاصہ روایات اور ایک شبہ کا جواب

زیادہ تر روایتوں کا خلاصہ یہی ہے کہ رحمت رحمانیہ تمام موجودات اور تمام نعمات کو شامل ہے اور رحمت رحیمیہ بمعنی توفیق دینی و دنیوی صرف مومنین کیلئے خاص ہے مگر بعض روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ صفت رحیمیت بھی مثل صفت رحمانیت کے کفار وغیرہ کو شامل ہے تو اسکا حل یہ ہے کہ صفت رحیمیت میں عموم و شمول اس لحاظ سے کہا ہے کہ کفار کو بھی ایمان اور دین کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ چنانچہ تفسیر امام حسن عسکریؑ میں ہے کہ

"الرحیم بعباده المومنین فی تخفیفه علیهم طاعاته وبعباده الکافرین فی الرفق فی دعائهم الی موافقته۔"

یعنی وہ اپنے مومن بندوں پر اس اعتبار سے رحیم ہے کہ اپنی عبادتوں کو انپر سہل بنا دیا ہے۔ اور کافروں پر اس لئے رحیم ہے کہ انکو اپنی طرف دعوت دینے میں نرمی برتی ہے

نفرِ تحقیق کا فیصلہ اس مقام پر نفرِ تحقیق کا فیصلہ یہ ہے کہ کوئی نعمت و رحمت اصلاً اور بالذات کسی کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ رحمتی وسعت کل شیئ "میری رحمت ہر شے کو شامل ہے" کہ مطابق ہر فرد کے لیے اس کی رحمت عام ہے مگر باعتبار صلاحیت و استعداد بعض کے ساتھ اختصاص ہو جاتا ہے چونکہ کفار نے صفت رحیمیت سے فیض عام اٹھانے کی صلاحیت خود کھو دیا ہے فما لھم فی الآخرۃ من خلاق (لہٰذا آخرت میں ان کے لئے کوئی حصہ نہیں رہا) بلکہ اس عالم میں کچھ ایسے بھی ملیں گے جو خدا کی صفت رحمانیت سے بھی فیض نہیں اٹھاتے مثلاً خودکشی یا حبس دم کرنے والے افراد۔ غرضکہ انسان جسقدر اپنی صلاحیت کو برباد کرتا جائے گا اسی قدر وہ صفت رحیمیت بلکہ صفت رحمانیت کے فیض سے بھی محروم ہوتا جائے گا۔

فقدان صلاحیت کو سمجھنے کیلئے ایک واضح مثال یہ دی جا سکتی ہے کہ ان اللہ علیٰ کل شیٔ قدیر کی بنا پر خدا ہر شے پر قادر ہے حتیٰ کہ محالات پر بھی لیکن محالات سے اسکی قدرت کا کوئی تعلق کبھی نہیں ہوتا کیونکہ خود محال میں اس کی قدرت کے قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ ورنہ اس کی قدرت تو عام اور ہمہ گیر ہے۔ بس اسی طرح کفار اپنی سرکشی کی بدولت صفت رحیمیت کے فیض سے خود محروم بن بیٹھے ہیں۔ لہٰذا عملاً یہ صفت مومنین کے ساتھ مخصوص ہو گئی۔

استنباط لطیف رحمٰن و رحیم کے مفہوم پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ملتا ہے وہ پچھلے جنموں کے کرموں کے بدلے میں نہیں ملتا ہے بلکہ ابتداءً اور بلا معاوضہ ملتا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ ("کل عالموں کی پرورش کرنے والے خدا کے لئے ہر قسم کی تعریف مخصوص ہے جو رحمٰن اور رحیم ہے۔")

(۱) عربی زبان میں تین لفظیں استعمال کی جاتی ہیں۔ ایک "مدح" دوسری "حمد" تیسری "شکر" ان کے معانی عام طور سے لوگ ایک سمجھتے ہیں لیکن درحقیقت ایسا نہیں بلکہ ان کے معانی میں نہایت دقیق اور لطیف فرق ہے۔ اس لئے ایک کا دوسری کی جگہ بولنا بلاغت کے خلاف ہے "مدح" اور "حمد" میں پہلا فرق یہ ہے کہ "مدح" جان دار اور بے جان دونوں طرح کی اشیاء کی تعریف پر بولی جاتی ہے۔ مثلاً موتی اور یاقوت کی جو تعریف ان کے حسن و خوبی کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ اسکو بھی "مدح" کہیں گے۔ جس طرح کسی انسان کی تعریف کو "مدح" کہتے ہیں۔ برخلاف اس کے موتی اور یاقوت وغیرہ بے جان چیزوں کی تعریف کو حمد نہیں کہہ سکتے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ "مدح" ہر اس کلام کو کہتے ہیں جس سے ممدوح کی ذات میں کسی طرح کی فضیلت کا موجود ہونا ظاہر ہو خواہ اس کے وجود میں اس ممدوح کے اختیار کو کوئی دخل ہو یا نہ ہو، مثلاً اگر کسی شخص کے قد و قامت یا حسن و جمال کی تعریف کی جائے تو اسکو مدح کہیں گے۔ مگر حمد فقط اسی کلام کو کہتے ہیں جس سے کسی کی وہ فضیلت ظاہر ہو جو اسکے اختیار سے عالم وجود میں آئی ہو۔ مثلاً انعام و احسان وغیرہ۔

اسی طرح "حمد" اور "شکر" میں یہ فرق ہے کہ "حمد" مطلقاً احسان و انعام پر کی جاتی ہے خواہ وہ "حمد" کرنے والے پر کیا گیا ہو۔ یا کسی دوسرے پر۔ اسی لئے معصوم نے اپنی دعا میں فرمایا ہے علیٰ کل نعمۃ انعم بہا علی وعلیٰ کل احد من الناس ممن کان اویکون الیٰ یوم القیامۃ مگر "شکر" اسی انعام و احسان کے ساتھ مخصوص ہے جو شکر کرنے والے پر کیا گیا ہو۔

بالجملہ ان لفظوں کے معنی میں جو دقیق۔ لطیف وجوہ فرق موجود ہیں ان کے معلوم کرنے سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ اس آیت میں لفظ "حمد" کا ذکر کرنا ہی مقتضائے بلاغت تھا۔ کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خداوند عالم حی و قادر و مختار ہے اور اسکا احسان و انعام عام ہے۔ اگر اس جگہ مدح یا شکر کی لفظ استعمال کی جاتی تو یہ باتیں معلوم نہ ہو سکتیں۔

(۲) لفظ الحمد میں "الف لام" استغراق کا فائدہ دیتا ہے جس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ جتنی حمد و ثنا عالم میں ہو سکتی ہے ان سب کی درحقیقت مالک اور مستحق خداوند عالم کی ذات ہے۔ اس کے سوا کسی دوسرے کو اسکا واقعی حق حاصل نہیں۔ کیونکہ اگرچہ بظاہر عالم میں دوسروں سے بھی نعمتیں لوگوں کو حاصل ہو جاتی ہیں اور اس لئے وہ ان نعمت دینے والوں کی مدح و ثنا بھی کرتے ہیں مگر وہ اسکے اصلی مستحق قرار نہیں پا سکتے کیونکہ ہر صاحب نعمت دراصل خداوند عالم ہی کی دی ہوئی نعمتوں کو دوسروں تک پہنچاتا ہے اور اسکا لینے والا بھی ان نعمات سے اسی وقت فائدہ اٹھا سکتا ہے جبکہ فائدہ حاصل کر سکنے کے اسباب بھی موجود ہوں۔ اور ان کا موجود ہونا خداوند عالم ہی کے انعام و احسان پر منحصر ہے۔ مثلاً دوسروں کی دی ہوئی نعمتیں خواہ وہ کتنی ہی خوشنما نظر آ رہی ہوں، ان کی سیر سے حظ اٹھانا قوت باصرہ کے موجود ہونے کا محتاج ہے اور کیسے ہی لذیذ کھانے سامنے رکھ دئے جائیں ان کی لذت سے محظوظ ہونے کیلئے قوت ذائقہ کی سلامتی کی احتیاج ہے۔

(۳) جو لوگ تمام انسانی افعال کو خداوند عالم کی مشیت کا نتیجہ بتاتے ہیں اور جملہ حرکات و سکنات بشری کا خالق اسی کو سمجھتے ہیں انھوں نے ایمان کے مخلوق الٰہی ہونے پر الحمد للہ کے جملہ سے استدلال کیا ہے اور وہ بھی کئی وجہوں سے جو مع جوابات مندرج ذیل کی جاتی ہیں۔

(پہلی وجہ) جس کا کام سب سے اشرف و اکمل ہوگا۔ اور جس سے ایسی نعمت عالم وجود میں آئے گی۔ جو تمام نعمتوں سے اعلیٰ و افضل ہو۔ وہ سب سے زیادہ حمد کا مستحق قرار پائیگا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مخلوقات و موجودات میں کوئی ایسی نعمت نہیں پائی جاتی جو باعتبار شرف و فضیلت نعمت ایمان سے بڑھ کر درجہ رکھتی ہو پس اگر ایمان انسان کا فعل ہو اور اسکے اختیار و قدرت سے موجود ہوتا ہو تو وہ خداوند عالم سے زیادہ حمد کا مستحق قرار پائے گا۔ اور یہ ہو نہیں سکتا۔ کہ بندہ کا استحقاق حمد معبود کے استحقاق سے بڑھ جائے۔ لہٰذا ایمان انسانی اختیار و قدرت سے مخلوق نہیں ہو سکتا۔

(جواب) یہ استدلال محض مغالطہ ہے۔ کیونکہ ایمان سے اشرف و اعلیٰ وہ نعمت ہدایت ہے۔ جس نے انسان کو ایمان کے درجہ پر پہنچایا۔ اور وہ نعمت عقل ہے۔ جس نے ہدایت الٰہی کی روشنی میں انسان کو ایمان طرف رہبری کی اور وہ انبیاء و رسل ہیں جنھوں نے انسانی عقل کو کفر و ضلالت کی تاریکیوں میں پڑکر کور چشم ہو جانے سے بچایا۔ اگر یہ تمام نعمتیں پہلے خداوند عالم کیطرف سے عطا نہ کی جاتیں تو بندہ کبھی نعمت ایمان سے آشنا نہ ہوتا۔ لہٰذا انکا درجہ اس نعمت ایمان سے کہیں زیادہ بلند ہے اور اس صورت میں کہ انسان اپنے ایمان کا خود فاعل و خالق ہو اسکا استحقاق حمد خداوند عالم کے استحقاق سے ہرگز بڑھ نہیں سکتا علاوہ اس کے ایمان ہو یا دیگر افعال انسانی اگرچہ سب کے سب براہ راست تو انسان ہی کی قوت و قدرت سے عالم وجود میں آتے ہیں۔ لیکن اس میں خداوند عالم کی دی ہوئی بہت سی نعمتیں بھی کام میں آتی ہیں اور خود وہ قوت و قدرت بھی جس کے بغیر انسان کسی حرکت و سکون پر قادر نہیں ہو سکتا۔ خداوند عالم ہی کی عطا کی ہوئی نعمت ہے۔ اس لئے انسان اپنے کسی عمل خیر پر خواہ اسکا تعلق اعضائے باطنہ سے ہو یا ظاہرہ سے درحقیقت حمد کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اسکا حقیقی استحقاق اسی کو ہوگا جس نے وہ اعضاء و جوارح عطا کئے اور انمیں قوت و قدرت مرحمت فرمائی انسانی افعال کی بحث آئندہ مفصل آئے گی

(دوسری وجہ) امت کا اس پر اجماع ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی نِعْمَۃِ الْاِیْمَانِ کہنا صحیح ہے لیکن اگر ایمان بندہ کا فعل قرار دیا جائے تو یہ کہنا غلط و باطل ہوگا کیونکہ کسی کی حمد ایسے فعل پر کرنا جو اس نے نہ کیا ہو قبیح ہے اور وہ اس لئے کہ خداوند عالم نے مذمت کے طور پر فرمایا ہے وَّیُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا ۔ یعنی وہ لوگ چاہتے ہیں کہ ان کی حمد کیجائے اس فعل پر جو انھوں نے کیا نہیں ہے۔

(جواب) یہ استدلال بھی صحیح نہیں کیونکہ ہم پہلے بتا چکے کہ اگرچہ ایمان براہ راست انسانی فعل ہے مگر وہ بہت سے ایسے اسباب کے موجود ہونے اور موانع کے دور رہنے پر موقوف ہے جن پر انسان کو کسی طرح قدرت حاصل نہیں۔ لہٰذا حمد کا واقعی استحقاق خدا کے سوا انسان کو نہیں ہو سکتا۔ اور اس

نعمت ایمان کی بنا پر خدا کی حمد اس اعتبار سے نہیں کی جائے گی۔ کہ وہ محض فعل بشری ہے تاکہ اس کی بنا غیر کے فعل پر قرار پائے اور قباحت کی باعث ہو۔ بلکہ اس لحاظ سے کی جائے گی۔ کہ ایمان کے وجود کا وسیلہ وہ بڑی بڑی نعمتیں ہوتی ہیں جو اسی کی دی ہوئی ہیں، اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ "الحمد للہ علی نعمۃ الایمان" کہنے والا درحقیقت اس ایمان پر حمد خدا نہیں کرتا جو انسان کا فعل ہے۔ بلکہ وہ ان بے شمار نعمت عظمیٰ پر اس کی حمد کرتا ہے جن کے بغیر نعمت ایمان کا حاصل ہونا ممکن نہ تھا۔ اگر کوئی بادشاہ اپنی رعایا کے لئے جملہ اسباب کمالات مہیا کر دے اور وہ لوگ کمال حاصل کریں تو ان کاملین کے ساتھ ساتھ بلکہ ان سے پہلے اور بہت زیادہ حمد و ثنا کا استحقاق اس بادشاہ کو حاصل ہوگا۔ مگر نہ اس تحصیل کمال کے اعتبار سے جو کہ رعایا کا فعل ہے بلکہ اس لحاظ سے کہ اسی کے مہیا کئے ہوئے اسباب سے اس کمال کا حاصل کرنا ممکن ہوا۔ اس بیان سے ظاہر ہو گیا کہ آیۂ مذکورہ کو پیش کرنے میں استدلال کرنے والے نے دھوکا کھایا ہے۔ کیونکہ جو لوگ نہ کئے ہوئے کاموں پر حمد و ثنا کے طالب ہوتے تھے ان کو کسی طرح کا تعلق ان کاموں سے نہ ہوتا تھا۔ اور یہاں ایسا نہیں کیونکہ بندہ کے ایمان سے خدا کو اگرچہ براہ راست فاعلیۃ و خالقیۃ کا تعلق نہیں ہے مگر اسکے عطا کئے ہوئے اسباب پر موقوف ہونے کے سبب اس سے بالکل بے تعلق بھی نہیں۔

(۴) لفظ "رب" کے معنی "پالنے والے" کے ہیں اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمام موجودات و مخلوقات عالم جس طرح وجود و خلق میں خالق کی احتیاج رکھتے ہیں۔ اسی طرح بعد موجود و مخلوق ہونے کے بھی اس کی تربیت کے ہر لحظہ محتاج ہیں۔ ایسا نہیں ہوا کہ موجود ہونے کے بعد اپنی بقا اور ممکن کمالات کے حاصل کرنے میں اس سے مستغنی ہو گئے ہوں۔ اسی لئے اس مقام پر "خالق العالمین" نہیں فرمایا کیونکہ اس سے فقط وجود میں موجودات عالم کی احتیاج ظاہر ہوتی۔

نیز ہر پالنے والا اپنی تربیت کی ہوئی شئے کا مالک بھی ہوتا ہے اسی لئے "مالک" کے بجائے "رب" کی لفظ اکثر استعمال کیجاتی ہے۔ مثلاً "رب البیت" گھر کے مالک کو کہتے ہیں۔ ہاں اتنی شرط البتہ ہے کہ وہ پرورش اجر حاصل کرنے کی غرض سے نہ ہو۔ پس رب العالمین کہنے سے جہاں یہ ظاہر ہوا کہ وہ تمام موجودات عالم کا پالنے والا ہے۔ وہاں یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ انکا مالک بھی ہے (الرحمٰن الرحیم کی تفسیر گذر چکی ہے۔)

مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ○ (فیصلے کے دن کا مالک ہے)

(۱) اس آیت کے متعلق یہ سوال کیا جاتا ہے کہ "کیا خدا ہمیشہ انصاف نہیں کرتا۔ کسی خاص دن

انصاف کرتا ہے۔"

لیکن اسکی غلطی ظاہر ہے کیونکہ کسی خاص دن انصاف کرنے کیلئے یہ کب لازم ہے کہ وہ ہمیشہ انصاف نہ کرتا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ باتوں میں ہمیشہ انصاف کرتا ہو۔ اور بعض امور میں انصاف کرنے کے لئے بمصلحت تاخیر کرے اور ایک خاص دن مقرر کردے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ انصاف کا تعلق خود خداوندعالم کے کاموں سے بھی ہے۔ اور بندوں کے افعال سے بھی۔ پس وہ اپنے کاموں میں تو ہر آن اور ہر لحظ انصاف کرتا رہتا ہے، کبھی کسی پر ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کرتا لیکن بندوں کے افعال میں انصاف کرنے کے لئے ایک خاص دن مقرر کردیا ہے۔ جس میں ہر نیک و بد عمل کی جزا و سزا بقدر استحقاق ہر شخص کو دیگا اور اس میں عقلاً کوئی قباحت نہیں۔

یہ سوال خود ان لوگوں پر بھی وارد ہوتا ہے جنھوں نے قرآن پر وارد کیا ہے کیونکہ وہ محض اسی انصاف اور جزا و سزا کی بنا پر تناسخ کے قائل ہیں۔ لہٰذا ان کو یہ بتانا چاہیے کہ کیا انسان کے ایام حیات میں انصاف نہیں کرتا۔ اسکے مرنے کے بعد ہی کرتا ہے؟ پس جو جواب اس سوال کا دیں اسے ہماری طرف سے بھی قبول کریں۔

(۲) "روز جزا کا مالک" کہنے سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ خداوندعالم اس وقت سارے جہان کا مالک نہیں ہے۔ فقط اسی دن کا مالک بن جائے گا بلکہ اس تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ پہلے رَبِّ الْعٰلَمِیْن فرمادیا ہے جس سے ہر زمانے میں اس کا مالک ہونا بھی ثابت ہوتا ہے جیسا کہ مذکور ہوچکا۔ پھر دوبارہ اس کے کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ البتہ منکرین معاد کو یہ بتا دینے کی ضرورت تھی کہ قیامت کا بھی ایک دن ہوگا۔ جس میں بندوں کو ان کے اعمال کی سزا و جزا دیجائے گی اور خداوندعالم اس دن کے لانے پر قادر ہے۔ یہیں سے یہ شبہ بھی رفع ہوجاتا ہے کہ روز جزا ابھی موجود نہیں اور جو شئے موجود نہ ہو اسکا مالک کوئی کیونکر ہوسکتا ہے۔"

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ○ (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں)

(۱) اس آیت میں عبادت کو طلب اعانت پر مقدم رکھا ہے۔ اور کئی وجہوں سے یہی بہتر تھا۔

(پہلی وجہ) عام دستور ہے کہ جب تک بارگاہ سلطانی میں تقرب حاصل نہ ہوجائے۔ رعیت اپنی حاجتیں پیش نہیں کرتی۔ اور اپنی مہمات میں اعانت کی طالب نہیں ہوتی۔ اگر بغیر تقرب حاصل کئے ایسا کرے تو ہرگز مناسب نہ ہوگا۔ پس عبادت کو اسی لئے مقدم رکھا گیا کہ پہلے بارگاہ الہٰی میں تقرب حاصل ہوجائے اس کے بعد بندہ اپنی حاجتیں اسکے سامنے بیان کرے۔ اور اپنی مہمات میں اعانت کا طالب ہو۔ اگر عبادت

کو وسیلہ نہ بنائے تو کبھی مستحق اجابت نہیں ہوسکتا۔ عام اس سے کہ وہ اعانت طلب کرنا عبادت ہی کے معاملہ میں مقصود ہو یا اپنی ان تمام حاجات میں جو بغیر خدا کی مدد کے پوری نہیں ہوسکتیں۔

(دوسری وجہ) عبادت کا شروع کردینا بندہ کے اختیار میں ہے لیکن اسکو پورا کرنا اسکی قدرت سے باہر ہے۔ ممکن ہے کہ عبادت کے درمیان بیماری، موت اور ایسے دیگر مخالف حالات پیدا ہوجائیں جن سے وہ تمام نہ ہوسکے۔ لہٰذا عبادت میں مصروف ہوجانے کے بعد اس کے تمام ہوسکنے کے لئے معبود سے مدد کی درخواست کرنا ہر عبادت گزار پر لازم ہے اور آیۂ زیر بحث میں اسکی تعلیم دیگئی ہے

(تیسری وجہ) اس آیت کے بعد جو آیات مذکور ہیں یعنی "اھدنا الصراط المستقیم الخ" ان میں اسی اعانت کی تفصیل ہے جس کی "ایاك نستعین" کہہ کر بندہ درخواست کرتا ہے۔ اور اسکو یہ عرض کرنا مقصود ہوتا ہے کہ میں جو اعانت تجھ سے طلب کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ تو مجھے سیدھے راستے کیطرف کر الخ پس اگر ان فقروں کو بعد کی آیتوں کے قریب نہ ذکر کیا جاتا تو ترتیب میں خلل پڑ جاتا۔ اور مقصود استعانت کی توضیح و تشریح نہ ہوسکتی۔

بالجملہ ان وجوہ مذکور پر غور کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ مخالفین اسلام کا یہ اعتراض کہ "عبادت سے پہلے مدد مانگنی چاہیئے اس لئے یہ آیت بلاغت کے خلاف ہے" درست نہیں کیونکہ جو ترتیب الفاظ اس آیت میں موجود ہے اسکا ہونا ہی بلاغت کے خلاف ہوتا۔

(۲) بندہ کو اپنے افعال میں مجبور جاننے والے اس آیت کو اپنی رائے کا موید سمجھتے ہیں اس لئے کہ اگر بندہ اپنے افعال کا مستقل فاعل ہو تو خدا سے مدد چاہنا بے کار ہوگا۔ مگر اس خیال میں بھی انھوں نے دھوکا کھایا ہے۔ کیونکہ بندہ کے فاعل با اختیار ہونے ہی کے سبب اسکو خدا سے اعانت طلب کرنے کی حاجت ہوتی ہے۔ اگر مجبور ہوتا اور وہ تمام اعمال اسکے کئے ہوئے نہ ہوتے تو پھر ان میں مدد چاہنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ اور یہ درخواست بالکل بے قاعدہ ہوجاتی۔ خدا سے مدد چاہنے کی ضرورت اسلئے پڑتی ہے کہ اگرچہ بندہ اپنے کاموں پر قدرت و اختیار رکھتا ہے مگر انکے انجام دینے کے لئے کچھ ایسے اسباب کی ضرورت بھی ہوتی ہے جو ان سے بعید تعلق رکھتے ہیں اور ایسے امور کا دور ہوجانا بھی ضروری ہوتا ہے جو ان کے کاموں میں خلل انداز ہوں۔ اور چونکہ ان اسباب و موانع کا دور ہوجانا بندہ کو اسکے کاموں پر مجبور نہیں کرتا۔ جیسا کہ آئندہ تفصیل سے مذکور ہوگا۔ پس بندہ کے مستقل فاعل ہونے کے معنی فقط یہ ہیں کہ وہ موافق اسباب کے وجود اور ناموافق امور کے عدم کی حالت میں اپنے کاموں کو محض اپنے اختیار و قدرت سے کرتا ہے ارادۂ خداوندی کی اسمیں شرکت نہیں ہوتی اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ بندہ کے کاموں میں وجود اسباب

عدم موانع کی حاجت ہی نہیں ہوتی۔ یا وہ ان اسباب و موانع پر بھی پورا اختیار رکھتا ہے۔ بالجملہ انسان باوجود قدرت و اختیار کے خدا کی مدد سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے فاعل با اختیار ہونے میں کوئی خلل نہیں پڑتا۔"

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (خاص راہ حق پر ہم کو ثابت قدم رکھ)

اس آیت کے معنی میں دو احتمال ہو سکتے ہیں (پہلا احتمال) یہ ہے کہ سیدھے راستے کیطرف ہدایت طلب کرنا مقصود ہے۔ اس بنا پر ایمان کی طرف ہدایت کی درخواست مراد نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ جو نماز گزار اپنی نمازوں میں درخواست کرتا ہے وہ پہلے ہی سے با ایمان ہے لہٰذا انکا مقصود دعا یہ ہوگا کہ خداوند عالم اسکو تمام اعمال و اخلاق میں سیدھے راستے کیطرف ہدایت کرے۔ اور اس مطلب کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کے اکثر اعمال و اخلاق کا منشاء وہی دو بڑی قوتیں ہوتی ہیں جو خالق حکیم نے اس کے نفس کے اندر خلق فرمائی ہیں۔ ایک قوت شہویہ دوسری قوت غضبیہ، انھیں دونوں قوتوں کے اعتدال پر رکھنے سے انسان عادل بنتا ہے۔ اور حد اعتدال سے کم یا زیادہ ہو جانے سے ظالم و عاصی ہو جاتا ہے۔ ان قوتوں کی افراط و تفریط کے دونوں پہلو نہایت برے اور خطرناک ہیں کیونکہ ان دونوں حالتوں میں انسان کے اعمال و اخلاق کے لئے بے شمار راہیں کھل جاتی ہیں۔

اور وہ سب کی سب کج و اکج ہونے کے سبب منزل نجات تک پہنچانے کے بجائے دینی و دنیوی ہر دو اعتبار سے تباہی و بربادی کے عمیق اور تاریک گڑھے میں گرا دیتی ہیں۔ نجات و فلاح کا راستہ فقط وہی ہوتا ہے جو افراط و تفریط کے دونوں کناروں کے بیچ سے ہو کر گزرتا ہے کیونکہ اس میں کجی بالکل نہیں ہوتی۔ جس سے انسان منزل مقصود سے بھٹک جائے۔ پس ہر با ایمان کو یہ دعا کرنا لازم ہے کہ خداوند عالم اس کی مدد کرے۔ اور اُن بے شمار کج راہوں سے بچا کر اس کو وہ راہ دکھا دے جو استقامت کے سبب باعث نجات ہو کیونکہ اگرچہ وہ اپنے اعمال کا با اختیار فاعل ہے۔ اور اپنے اخلاق کی اصلاح پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ مگر اسکی عقل میں اتنی قوت کہاں کہ بے شمار پیچیدہ و کج راہوں میں سے ایک باعث نجات سیدھے راہ کی تمیز کر لے۔ اور بغیر مدد الٰہی اسکی طرف ہدایت پا جائے۔

(دوسرا احتمال) یہ ہے کہ صراط مستقیم کیطرف ہدایت مراد نہیں بلکہ یہ اس پر ثابت قدم رکھے جانے کی درخواست ہے اور اس بنا پر "صراط مستقیم" سے فقط راہ ایمان بھی مراد ہو سکتی ہے اور مقصود دعا بالکل درست ہوگا کیونکہ اگرچہ ایمان کی راہ پر قدم رکھ دینا بندے کے اختیار میں ہے لیکن اسپر اس طرح ثابت قدم رہنا کہ پاؤں کو کہیں لغزش نہ ہو اور یوں طے کر جانا کہ امن و راحت کے سوا کسی خطرہ و زحمت کا سامنا نہ ہو بغیر مدد الٰہی

کے ناممکن ہے۔"

اس بیان کو بغور پڑھ لینے کے بعد آیہ مبحوث عنہا کے متعلق کسی دل میں یہ شبہ پیدا نہیں ہو سکتا کہ جو لوگ نمازوں میں خداوند عالم سے "صراط مستقیم" کیطرف ہدایت طلب کرتے ہیں وہ پہلے ہی سے مومن و ہدایت یافتہ ہوتے ہیں پھر ان کی یہ ہدایت طلبی خداوند عالم سے تحصیل حاصل کی درخواست نہیں تو اور کیا ہے!

اسی طرح یہ اعتراض بھی وارد نہیں ہوتا کہ "جو لوگ خداوند عالم کے عدل کے قائل ہیں ان کی یہ رائے اگر صحیح ہو کہ ادلّہ و براہین کے ذریعہ خلق کو نجات کی راہ کیطرف ہدایت کر دینا خداوند عالم پر لازم ہے تو یہ طلب دعا بے فائدہ ہوگی۔ کیونکہ ہدایت کے درجے مختلف ہیں الطاف خداوندی سے جس قدر دلیلیں زائد معلوم ہوتی جاتی ہیں اسی قدر ہدایت میں زیادتی ہوتی رہتی ہے۔ پس اگرچہ مطلقاً راہ نجات کی طرف بندوں کو ہدایت کرنا خداوند عالم پر بے شبہ واجب ہے لیکن یہ واجب نہیں کہ وہ تمام دلائل و براہین کو ظاہر کر کے ہدایت کے آخری درجات تک بھی پہنچا دے۔ بلکہ یہ امر محض اس کے تفضل پر موقوف ہے۔ لہٰذا بندوں کی طلب و دعا بے فائدہ نہ ہوگی۔ اور یہ امر کہ انسان کی طلب و دعا سے خداوند عالم تفضل فرماتا ہے اور ہدایت میں زیادتی عطا کرتا ہے اس آیت میں صاف طور سے مذکور ہے والذین اهتدوا زادهم هدیً (جن لوگوں نے ہدایت طلب کی خدا نے انکی ہدایت میں اضافہ کر دیا)

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ (ان کی راہ جنھیں تو نے اپنی نعمت عطا کی ہے)

اس آیت نے بتا دیا کہ سیدھی راہ وہی ہے جس پر خدا کے خاص بندے جنکو اس نے مخصوص نعمتیں عطا کی تھیں۔ چلتے تھے اور انھیں کی پیروی کر کے انسان نجات پا سکتا ہے لیکن یہاں یہ بھی معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ نعمتیں کیا تھیں اور وہ انعام و احسان خدا نے کن لوگوں پر کیا تھا۔

ظاہر ہے کہ خدا کی نعمت سے عالم کا ایک ذرہ بھی خالی نہیں۔ دنیا کی عام نعمتوں میں اس نے مومن و کافر مطیع و عاصی کا امتیاز ملحوظ نہیں رکھا۔ پس یہاں اگر دنیا کی عام نعمتیں مراد ہوں تو تمام کفار و خطاکار "اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" میں داخل ہو جائیں گے حالانکہ جن راہوں میں وہ لوگ چل رہے ہیں وہ قابل طلب نہیں۔ نیز یہ دعا کرنے والا خود بھی خدا کی نعمتوں سے خالی نہ ہونے کے سبب انھیں لوگوں میں شامل ہو جائے گا۔ جن کی بابت "اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" کہہ رہا ہے اور لازم آئے گا کہ وہ خود اپنی ہی راہ کی طرف ہدایت کا طالب ہو۔

نیز ان انعام و احسانِ الٰہی کے پانے والوں کی دوسری صفت "غیر المغضوب علیهم" بیان کی گئی ہے جس سے ظاہر ہوا کہ ان سے کبھی کوئی ایسا قول و فعل سرزد نہیں ہو سکتا جس سے خدا غضبناک ہو

ان کے تمام اقوال وافعال ایسے ہی ہوں گے جو خدا کی رضامندی کے باعث ہوں۔ اور یہ شان معصوم کے سوا کسی دوسرے کی نہیں ہو سکتی پس ثابت ہوا کہ اس آیت میں وہی برگزیدہ بندے مراد ہیں۔ جو معصوم ہوں۔ اور نعمت سے عصمت اور اسکے لوازم مراد ہیں۔ اور انسان کو اہل عصمت کی پیروی کرنا اور انھیں کی راہ کا طالب ہونا چاہیئے کیونکہ فلاح ونجات کا یقین اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے۔ جو لوگ معصوم نہ ہوں انکی بنائی ہوئی راہ پر چلنا نجات کا باعث نہیں ہو سکتا۔ لیکن عصمت ایک مخفی وباطنی صفت ہے جو عام طور سے سب پر ظاہر نہیں ہوتی۔ اسی لئے معصوم کی معرفت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ خود خداوند عالم کسی ذریعہ سے اس کی عصمت کا اظہار فرمائے۔ لہذا معصوم کی راہ کا پالینا بغیر خداوند عالم کی اعانت وہدایت کے بندوں کے لئے دشوار ہے۔ پس اس سبب سے ان کو بارگاہ الہٰی میں اس خاص راہ ہدایت کے لئے طلب ودعا کی احتیاج ہوئی۔

بالجملہ پروردگار عالم نے اس آیت میں مخلوق کو یہ بتایا ہے کہ انکو اہل عصمت ہی راہ پر چلنا چاہیئے اور وہ بغیر اسکی اعانت وعنایت کے اس راہ کی طرف ہدایت نہیں پا سکتے۔

ازالہ شبہ اس بیان سے معلوم ہوا کہ اس آیت کے جملہ "اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" میں دنیا کی عام نعمت اور راحت کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ یہاں خاص نعمتیں مراد ہیں۔ جو مخصوص لوگوں کو عطا کی گئی ہیں۔ لہذا مخالفین اسلام کو یہ اعتراض کرنے کی گنجائش نہیں مل سکتی۔ کہ جب مسلمان لوگ پہلا جنم اور پہلے کئے ہوئے گناہ اور ثواب نہیں مانتے تو بعض لوگوں پر رحمت کرنے اور بعض لوگوں پر نہ کرنے سے خدا طرفدار ٹھہرتا ہے کیونکہ گناہ وثواب کے بغیر رنج وراحت کا دینا تو قطعی بے انصافی کی بات ہے۔ بلا وجہ وہ کسی پر رحم وغضب نہیں کر سکتا۔"

اور اگر یہ کہا جائے کہ بعض لوگوں کو عصمت وغیرہا نعمات خاصہ سے مخصوص کرنا بھی بے انصافی ہے تو اسکا جواب یہ ہے کہ بے استحقاقِ عمل وخدمتِ سابقہ کسی پر تفضل کرنا نہ بے انصافی ہے نہ دوسروں پر ظلم وغضب۔ کیونکہ بے انصافی وغضب فقط یہ ہے کہ اپنے اعمال وخدمات کے اعتبار سے جس کو جو حق حاصل ہو گیا ہو اس پر مناسب جزا نہ دیجائے۔ جبتک کہ بندوں نے عملی خدمت سے اپنا کوئی حق ہی قائم نہ کیا ہو اس وقت تک کسی کو کوئی نعمت دینا تفضل ہوگا۔ جس کو کوئی عقلمند دوسروں پر ناانصافی یا غضب وظلم نہیں کہہ سکتا۔

نیز ازبسکہ حکمت الہٰی کا تقاضا یہی تھا کہ عام بنی نوع انسان غیر معصوم پیدا کئے جائیں۔ لہذا ضروری ہوا کہ کچھ لوگوں کو عصمت وغیرہا نعمات خاصہ سے مخصوص کر دیا جائے۔ تاکہ ان کی پیروی باعث ہدایت

نجات ہو سکے۔ پس یہ انعام خاص عین انصاف وعدل ہے اسکو ظلم وناانصافی سمجھنا ناسمجھی ہے۔ اس مطلب کو ہم آئندہ مناسب مقام میں تفصیل سے لکھیں گے۔ اس وقت بطور شاہد صرف ایک روایت پیش کرتے ہیں

مصداق صراط مستقیم مندرجہ ذیل روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ "صراط مستقیم" سے محمد وآلِ محمد علیہم السلام کا راستہ مراد ہے۔

عن مسلم بن حیان قال سمعت ابا بریدة یقول صراط محمد وآلہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (اخرجہ الثعلبی فی تفسیرہ وصاحب معالم التنزیل) ارجح المطالب مولوی عبید اللہ

غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ (نہ ان کی راہ جن پر تیرا غضب ڈھایا گیا اور نہ ان کی راہ جو گمراہ ہیں۔")

اس منفی پہلو کی ضروری توضیح اثباتی پہلو "اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" کے ذیل میں کی جا چکی ہے۔

حسن نظم وترتیب اس سورہ کی آیتوں میں جو ترتیب خداوند عالم نے رکھی ہے اس سے بہتر کوئی ترتیب عقل میں نہیں آسکتی۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ کمال انسانی یہی ہے کہ وہ ربوبیت اور عبودیت کی معرفت حاصل کرے۔ یعنی اس کا رب کون ہے اور کیسا ہے۔ کیا کیا صفتیں اس کی ذات میں ہیں اور اسکا بندوں پر کیا حق ہے۔ اور اسے کس طرح ادا کرنا چاہیئے۔ نیز یہ کہ اس تک پہونچنے کا وسیلہ کیا ہے۔ کس راہ پر چل کر اور کن لوگوں کی پیروی کر کے تقرب الہٰی اور فلاح ونجات کا حاصل ہونا ممکن ہے۔ ان تمام امور کو بحد کمال نہایت مختصر لفظوں میں جس نظم وترتیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ وہ انسانی طاقت سے باہر ہے۔ پہلے ان آیات بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ﴿ الحمد للہ رب العلمین ﴿ الرحمٰن الرحیم ﴿ مالک یوم الدین میں کمال ربوبیت کو ذکر کیا۔ اور بتا دیا کہ خالق عالم کون ہے اور اسکی صفات کیا ہیں۔ پھر آیہ "ایاک نعبد وایاک نستعین" میں معرفت عبودیت کا کمال بیان کیا اور یہ سکھایا کہ بندوں کو اسی کا مطیع وعبادت گذار رہنا چاہیئے۔ اور اپنی حاجات ومہمات میں اسی سے مدد مانگنی چاہیئے۔ پھر اس کے بعد کی آیات اھدنا الصراط المستقیم الخ میں یہ بتایا کہ بندہ فقط سیدھی راہ پر چل کر خالق تک پہونچ سکتا ہے اور وہ راہ انھیں لوگوں کی ہے جو اہل عصمت ہیں۔ انھیں کی پیروی کر کے گمراہی اور غضب الہٰی سے اس کو نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

الٓمّٓ (۱) قرآن کے اکثر سورے حروف تہجی سے شروع کئے گئے جن کے مفہوم کی بابت علمائے اسلام میں سے کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ سوائے خدا کے اور کسی کو معلوم نہیں۔ لیکن یہ خیال غلط ہے کیونکہ خداوند عالم کی طرف سے کسی ایسے کلام کا نازل کیا جانا جس کا مفہوم تمام خلق سے پوشیدہ رکھا گیا ہو بالکل عبث ہوگا۔ اور فعل عبث کا اسکی ذات سے صادر ہونا ممکن نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ان مقطعات قرآنی کا علم انھیں لوگوں کے لئے مخصوص رکھا گیا ہے جن کے گھر میں وہ نازل کئے گئے عوام الناس کی عقلیں براہ راست ان تک نہیں پہونچ سکتیں۔ اور اس میں کوئی خرابی نہیں کہ کلام الہٰی کے بعض حصوں کا علم کسی مقصد سے محض مخصوص لوگوں کو عطا کیا گیا ہو۔ عام لوگوں کو بغیر دوسرے وسیلہ و واسطہ کے محض ان کی فہم و عقل کے ذریعے نہ معلوم ہو سکتے ہوں۔ اس مطلب کی تفصیل آیہ لایعلم تاویلہٗ الا اللہ والرّاسخون فی العلم کی تفسیر میں آئندہ مذکور ہوگی۔

اگر میرے اس کلام پر کسی کو اعتراض ہو کہ جب یہ مقطعات قرآنی محض رموز و اشارات ہیں جن سے عام لوگوں کو خطاب کرنا اور کسی بات کا بتانا مقصود نہ تھا۔ تو پھر عام لوگوں کو کیوں سنائے گئے۔ اور اس کلام کا جزو کس لئے بنائے گئے جس سے تمام خلق کی ہدایت و تعلیم منظور تھی۔ تو اسکا جواب یہ ہوگا کہ کلام الہٰی کی غرض و غایت کے متعدد و مختلف پہلو ہو سکتے ہیں اور ممکن ہے کہ اسکے باطن سے خاص لوگوں کو راز کے طور پر کوئی بات بتائی جائے۔ اور ظاہر لفظ سے عوام الناس کو کسی امر پر متنبہ کیا جائے۔ چنانچہ ان مقطعات قرآنیہ کی بابت احادیث میں جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ ان میں خداوند عالم نے اپنے مخصوص اسرار رسول سے بیان کئے ہیں۔ وہاں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان سے خلق کے سامنے تحدی اور اسکا عجز ظاہر کرنا مقصود ہے یعنی باوجود اس کے کہ یہ کلام بھی انھیں حروف تہجی سے مرکب ہے جن سے تمام الفاظ لغت عرب کے بنائے گئے ہیں اور لوگوں کی زبانوں پر جاری و ساری ہیں۔ مگر پھر بھی وہ اسکا مثل پیش کرنے پر قدرت نہیں رکھتے۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ (یہ) وہ کتاب ہے (جس کے کتاب خدا ہونے میں) کچھ بھی شک (نہیں)

اس کلام پر دو اعتراض کئے گئے ہیں:-

(پہلا اعتراض) اگر یہ کہنا مقصود ہے کہ اس کتاب میں عام بندوں کو کوئی شک نہیں تو یہ غلط ہے کیونکہ عالم میں شک کرنے والوں کی جتنی کثرت ہے وہ مخفی نہیں اور اگر یہ مقصد ہے کہ خود متکلم

یا اس کے معتقدین کو اس میں شک نہیں تو یہ کلام بالکل بے فائدہ ہوگا کیونکہ اس سے دوسروں کے شک کا انکار کیونکر ثابت ہو سکتا ہے

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ مقصود کلام یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کتاب میں کوئی شک کرنے والا موجود نہیں ہے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ یہ کتاب اپنے اندر وہ اوصاف و خصوصیات رکھتی ہے جن سے اسکا انسانی طاقت سے باہر ہونا بخوبی ظاہر ہے۔ لہٰذا کسی عاقل کو اس میں شک نہ ہو چاہیئے۔

(دوسرا اعتراض) اس آیت میں بطور استغراق نفی شک کیا گیا ہے۔ یعنی اس کتاب میں کسی طرح کا کچھ شک نہیں حالانکہ دوسری جگہ شک کا وجود ثابت کیا ہے اور وہ اس آیت میں" ان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا۔ پس ان دونوں آیتوں میں صریح اختلاف بیان موجود ہے۔

اس اعتراض کا جواب بھی وہی ہے جو پہلے اعتراض کا دیا گیا ہے یعنی "ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ میں مطلقاً شک کے وجود کی نفی نہیں کی گئی ہے جیسا کہ معترض نے سمجھا ہے۔ بلکہ یہ بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب قابل شک نہیں اور ظاہر ہے کہ کسی چیز میں لوگوں کے شک کرنے سے یہ لازم نہیں آتا۔ کہ وہ درحقیقت شک کے قابل بھی ہو۔ کیونکہ اکثر شک محض جہل اور تعصب اور دیگر اسباب سے بھی پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ حالانکہ وہ شئے قابلِ شک نہیں ہوتی۔ بالجملہ ان دونوں آیتوں کے معنیٰ ایک دوسرے سے علیحدہ ضرور ہیں مگر وہ اختلاف بیان موجود نہیں۔ جو معترض نے اپنی غلط فہمی سے دکھانا چاہا ہے۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (یہ پرہیزگاروں کی رہنما ہے) اس کلام پر دو اعتراض کئے جاتے ہیں

(پہلا اعتراض) تو وہی اختلاف بیان کا ہے، یعنی دیگر آیات میں تو یہ کہا ہے کہ قرآن سارے عالم کے لئے ہدایت ہے۔ اور یہاں خاص متقین کے لئے ہدایت بتایا ہے۔

(دوسرا اعتراض) یہ ہے کہ جو پرہیزگار لوگ ہیں وہ تو خود راہ راست پر ہیں اور جو جھوٹی راہ پر ہیں۔ ان کو یہ قرآن راہ ہی نہیں دکھلا سکتا تو پھر کس کام کا رہا۔

ان دونوں اعتراضوں کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ بے شبہ قرآن کا مقصود سارے عالم کو ہدایت کرنا ہے اور وہ ہدایت کو سب کے سامنے یکساں پیش کرتا ہے لیکن اس سے ہدایت وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جنکے دلوں میں خوف خدا کی جگہ ہوتی ہے۔ باقی لوگ اسکی ہدایات پر توجہ نہیں کرتے پس نتیجہ و مآل کے اوپر نظر کر کے یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ درحقیقت انھیں لوگوں کی ہدایت کرتا ہے جو اس سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ باقی لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔ بالجملہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کہنے کا یہ مقصود نہیں ہے کہ قرآن اپنی ہدایت صرف متقین ہی کے سامنے پیش کرتا ہے۔ دوسروں کو راہ راست کی طرف دعوت

نہیں دیتا۔ بلکہ یہاں متقین کی تخصیص محض اس لحاظ سے کی گئی ہے کہ وہی اسکی دعوت کو قبول کرتے ہیں۔ اور اسکی ہدایت وتعلیم سے منحرف نہیں ہوتے۔ اس مطلب کی توضیح اس مثال سے اچھی طرح ہوتی ہے کہ آگ جسطرح اپنی حرارت کا اثر لکڑی پر ڈالتی ہے۔ پتھر پر بھی ڈالتی ہے مگر وہ صلابت وکثافت کے سبب اسکے اثر کو قبول نہیں کرتا۔ لہٰذا قبول اثر اور حصول نتیجہ وثمر کے اعتبار سے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ آگ لکڑی کو جلاتی ہے اور پتھر کو نہیں جلاتی۔

اس تقریر سے پہلا اعتراض یوں دفع ہوگیا کہ جہاں قرآن کو سارے عالم کے لئے ہدایت کہا ہے وہاں ہدایت پیش کرنا اور راہ راست کی طرف دعوت دینا مراد ہے اور جس مقام پر متقین کی تخصیص مذکور ہے وہاں نتیجہ ومآل ہدایت قبول کرنے کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اور دوسرا اعتراض اسلئے برطرف ہوگیا کہ جہانتک سیدھی راہ دکھانے اور حق کی طرف دعوت دینے کا تعلق ہے اسکی ہدایت سب پر عام ہے۔ پھر اگر کچھ لوگ اس سے اثر نہیں لیتے تو اسکا کیا قصور اور وہ بے فائدہ کیونکر کہا جاسکتا ہے۔ ہاں اگر خفاش کی نظر سے دیکھتے ہوئے آفتاب کو بیکار کہنا کسی عقلمند کے نزدیک درست ہو تو یہ اعتراض بھی صحیح ہوسکتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ

(جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں، اور پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے راہ حق پر خرچ کرتے ہیں۔")

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (ترجمہ) اور جو کچھ اے رسول تم پر اور تم سے پہلے نازل کیا گیا ہے۔ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور وہی آخرت کا بھی یقین رکھتے ہیں یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے (دنیا میں) ہدایت یافتہ ہیں اور یہی لوگ (آخرت میں) فلاح یافتہ ہیں۔"

"غَیْب" ان چیزوں کو کہتے ہیں جنکا علم انسان کو اسکے ظاہری حواس خمسہ کے ذریعے سے نہ ہوسکتا ہو اور ان کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ چیزیں ہیں جو عقلی دلیلوں کے ذریعے معلوم ہوسکتی ہیں۔ مثلاً توحید ونبوت ومعاد وغیرہ۔ اور دوسری وہ چیزیں ہیں جن پر کوئی دلیل قائم کرنے سے انسان کی قوت فکر عاجز ہے۔ مثلاً عرش وکرسی وغیرہ۔ نیز غیب کی لفظ ان چیزوں پر بھی بولی جاتی ہے جو بالفعل انسان کے حواس کی حد ادراک سے باہر ہوں۔ اگرچہ وہ محسوس ہونے کے قابل ہوں۔ اسی اعتبار سے وہ امور بھی "غیب" کہے جاتے ہیں۔

جو اگلے زمانے میں گذر چکے یا آئندہ کبھی آنے والے ہیں۔

پس ایمان کا تعلق درحقیقت جملہ امور غیبیہ سے ہے اور ایمان کامل وہی جو ان تمام اقسام غیب کو شامل ہو۔ جن کی خدا ورسول نے خبر دی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (ترجمہ) (بیشک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے لئے برابر ہے اے رسول) خواہ تم انھیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔")

(۱) اس آیت میں "اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" کہنے سے تمام کفار کے ایمان قبول نہ کرنے کی خبر دینا مقصود نہیں ہے بلکہ فقط وہی کفار مراد ہیں جو آیات الٰہی کا کھلم کھلا انکار کرتے تھے۔ اور باوجود پوری کوشش کے رسول خدا کی باتوں سے کچھ بھی متاثر نہ ہوتے تھے۔ بلکہ ان کے انکار وسرکشی میں زیادتی ہی ہوتی جاتی تھی۔ لہٰذا ان کی ظاہری حالت یہی بتارہی تھی۔ کہ آئندہ کبھی ایمان قبول نہ کریں گے۔ پس جو کچھ خداوند عالم نے اس آیت میں فرمایا ہے۔ درحقیقت وہ ان کے پوشیدہ ارادوں اور نیتوں کا اظہار اور انکی زبان حال کی حکایت ہے اور اسکی ضرورت اس لئے ہوئی کہ آنحضرتؐ ان کفار کے معاملہ میں نہایت غمگین وفکرمند رہتے تھے۔ یہانتک کہ خداوند عالم نے یہ فرمایا فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا "

پس خدا نے ان کے ایمان قبول نہ کرنے کی خبر دی تاکہ آپ کا حزن وافسوس دفع ہوجائے اور مایوس ہوکر دل کو مطمئن کرلیں۔ مگر اس خبر کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں ان کو باایمان بنانا ہی نہیں چاہتا۔ لہٰذا وہ کافر رہیں گے۔ بلکہ یہ کہنا منظور ہے کہ ان کے دل اتنے سخت ہوچکے ہیں۔ اور کفر پر قائم رہنے پر ان کے ارادے اس قدر پختہ ہیں کہ تمہاری باتوں کا اب کچھ اثر نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا ان کی طرف سے مایوس ہوجاؤ اور فکر وحزن میں پڑے نہ رہو۔ بالجملہ یہ معلوم کرلینے کے بعد کہ اس آیت میں عام کفار کا ذکر نہیں ہے بلکہ مخصوص افراد کا ذکر ہے۔ نیز خداوند عالم نے انکے عدم ایمان کی بابت اپنے ارادے کا اظہار نہیں کیا ہے بلکہ انھیں کے خفیہ نیتوں کو ظاہر کیا ہے اور جو کچھ ان کے حالات سے عیاں تھا اسی کو بیان کیا ہے اس اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ اس آیت کے نزول کے بعد بہت سے کافروں نے رسولؐ خدا کے سامنے ایمان قبول کیا۔ لہٰذا ایمان نہ لانے کی خبر جھوٹی ہے اور اگر علم وارادہ خدا میں یہی گذرا تو پھر رسولؐ کو بھیجنا اور کتاب کا نازل کرنا عبث تھا۔

(۲) فرقہ امامیہ کا مذہب یہ ہے کہ خداوند عالم چونکہ حکیم وعادل ہے لہٰذا بندوں کو ایسے امور کی تکلیف نہیں دے سکتا۔ جو ان کی قدرت وطاقت سے باہر ہوں۔ ورنہ عقل صحیح کے نزدیک امر قبیح وظلم صریح کا مرتکب ٹھہریگا جس سے اسکی شان اجل وارفع ہے لیکن اسلام کے بعض فرقوں نے اسکو جائز بلکہ واقع بھی بتایا ہے اور باوجود اسکے

انکی عقلوں کے نزدیک خداوند عالم ظالم اور امر قبیح کا مرتکب نہیں اس وجہ سے کہ وہ مالک عباد ہے۔ اور اپنی ملک میں تصرف کرنا خواہ وہ کسی طرح کا بھی ہو ظلم اور قبیح نہیں کہا جا سکتا۔

اس کا محصل یہ ہوا کہ اگر وہی افعال بندوں سے سرزد ہوں تو ظلم اور قبیح کہے جائیں گے۔ اور اگر خداوند عالم سے واقع ہوں تو بہر طور حسن ہوں گے مثلاً ایک شخص اگر اپنے غلام کو یہ حکم دے کہ وہ آسمان اڑ جائے یا مشرق سے مغرب تک کی مسافت ایک لمحہ میں طے کر جائے تو وہ ظالم اور مرتکب قبیح قرار پائے گا۔ اور اگر خداوند عالم اپنے بندوں کو اسی کی تکلیف دے تو وہ بہر طور حسن اور عین عدل وحکمت کہی جائے گی۔ محض اس لئے اس کا تصرف خود اس کی ملک میں واقع ہوا ہے۔ حالانکہ اہل عقل کے نزدیک یہ امر قابل تسلیم نہیں ہو سکتا کہ اپنی ملک میں ہر طرح کا تصرف خواہ وہ بظاہر کتنا ہی برا ہو مستحسن ہے۔ کیونکہ جب کوئی اپنی مملوکہ چیزوں کو بیجا صرف کرتا نظر آتا ہے تو معمولی عقل وفہم رکھنے والا بھی اسکو سفیہ و دیوانہ ہی سمجھتا ہے۔

بالجملہ تکلیف مالا یطاق کو خدا کے لئے جائز بتلانے والوں نے آیہ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ الخ سے بھی اپنی رائے پر استدلال کیا ہے۔ اور امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں اس مقام پر اپنی قوت استدلال وجوہات آفرینی کا پورا ثبوت دیا ہے۔ از بسکہ یہ مسئلہ عدل نہایت اہم ہے اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی چند مایہ ناز دلیلوں کا محصل مع جواب پیش کر دیا جائے تاکہ فیصلہ ہو سکے کہ عقل کا رجحان کس طرف ہے۔ (پہلی دلیل) جبکہ خدا نے ایک شخص کی بابت یہ خبر دی کہ وہ ایمان نہ لائے گا تو ایمان قبول کرنا اسکی طاقت سے باہر ہو گیا۔ اب کبھی مومن نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر ایسا ہو تو خدا کی دی ہوئی خبر جھوٹی ٹھہری اور اسکا سبب یا تو جہل ہوگا۔ یا کوئی ذاتی حاجت وغرض اور دونوں باتیں اس کے لئے محال ہیں۔ لہذا اس کی خبر جھوٹی نہیں ہو سکتی۔ اور وہ شخص کبھی ایمان قبول کرنے پر قادر نہیں ہو سکتا۔ مگر باوجود اسکے اس کو ایمان کی تکلیف خدا کی طرف سے دی گئی ہے۔ لہذا یہ تکلیف مالا یطاق ہو گی۔

(جواب) استدلال میں اسکی تمیز نہیں کی گئی ہے کہ خدا کی خبر اسکے ایمان نہ لانے کا سبب ہوئی یا اسکا ایمان نہ لانا اس خبر کے بیان کرنے کا باعث ہوا۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ استدلال کرنے والے نے یہ سمجھا ہے کہ خدا کی خبر مکلف کی قوت وطاقت کو سلب کر لیتی ہے اسلئے وہ ایمان لانے پر قادر نہیں ہو سکتا حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ خدا کی خبر مکلف کی قدرت وطاقت پر کوئی اثر نہیں ڈالتی وہ اس خبر کے بعد بھی با اختیار وصاحب قدرت باقی رہتا ہے۔ اور اس خبر کا مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص باوجود قدرت و اختیار کے ایمان نہ لائے گا۔ اور چونکہ اس کا مستقبل خدا پر روشن ہے لہذا وہ یہ خبر دیتا ہے جو ہر خبر صادق ہوتی ہے۔ لیکن اس سے مکلف کے قدرت واختیار میں خلل نہیں پڑتا۔ جہانتک قدرت واختیار کا

تعلق ہے۔ انسان کی اور خدا کی خبروں میں کوئی فرق نہیں۔ یعنی جس طرح کسی انسان کے یہ خبر دینے سے کہ فلاں شخص ایمان نہ لائے گا اسکا اختیار سلب نہیں ہو جاتا۔ اسی طرح خدا کے خبر دینے سے بھی نہیں ہوتا۔ البتہ ان دونوں خبروں میں یہ فرق ضرور ہے کہ خدا کا علم مکلف کے مستقبل کو محیط ہوتا ہے۔ لہذا اس کے خلاف کوئی امر واقع نہیں ہوتا۔ اور انسان کو کسی کے مستقبل کا صحیح علم نہ ہوتا۔ لہذا اسکے خلاف ظہور میں آنا ممکن ہوتا ہے

اگر خداوند عالم کی خبر سلب اختیار وقدرت کا باعث ہوتی ہو تو اس میں بندوں کی تخصیص نہیں بلکہ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خود اسکی قدرت واختیار کو بھی سلب کر لیتی ہے۔ بعد اسکے وہ قادر ومختار نہیں ہوتا۔ کیونکہ قرآنی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے انبیاء سابقین کی امتوں کو حضرت خاتم النبیین کے مبعوث ہونے کی خبر دی ہے اور اسی طرح آئندہ کسی خاص وقت میں قیامت وعلامات قیامت کے واقع ہونے کی خبر دی ہے۔ لہذا یہ سوال ہو سکتا ہے کہ امم سابقہ کے عہد میں بعثت خاتم النبیین خدا کے اختیار و قدرت میں تھی یا نہیں؟ اور وقت معین سے پہلے قیامت اور اس کے علامات کا واقع کرنا اس کے اختیار میں ہے یا نہیں؟ اور وہ یہ قدرت رکھتا ہے یا نہیں کہ قیامت کو بغیر اظہار علامات کے دفعتاً واقع کر دے؟ اگر یہ جواب دیا جائے کہ امم سابقہ کے عہد میں خاتم النبیین کو مبعوث کرنے پر قادر تھا۔ اور قیامت کو جس وقت اور جس طرح چاہے واقع کر دینے کی قدرت رکھتا ہے تو ماننا پڑے گا کہ اس کی خبریں کاذب ہو سکتی ہیں۔ اور وہ خود اپنی تکذیب کر سکتا ہے۔ اور اگر اسکو امور مذکورہ پر قادر ومختار نہ بتایا جائے تو اسکا عاجز ومجبور ہونا لازم آتا ہے۔ بہر صورت محالات کے پنجوں سے دامن ایمان کو چھڑانا دشوار بلکہ محال ہو جاتا ہے

(دوسری دلیل) جبکہ خدا کو کسی مکلف کی بابت یہ علم ہوا کہ وہ ایمان قبول نہ کرے گا۔ تو اس سے ایمان کا صدور نہیں ہو سکتا۔ ورنہ لازم آئے گا کہ علم خدا متغیر اور جہل کی طرف منقلب ہو جائے۔ اور یہ محال ہے اور جس امر سے محال لازم آتا ہو وہ خود محال ہوتا ہے۔ پس مکلف کا ایمان لانا بھی محال ہوگا۔ حالانکہ اسکو تکلیف ایمان دی گئی ہے۔

(جواب) یہ تقریر بھی مغالطہ ہے کیونکہ یہ بتانا چاہیئے کہ خداوند عالم کو یہ علم ہوا ہے کہ بندہ خود اسی کے اختیار وارادہ سے ایمان نہ لائے گا۔ یا اپنے اختیار وارادہ سے؟ اگر پہلی صورت ہے تو اس مسئلہ میں بحث کرنے سے پیشتر یہ طے کر لینا چاہیئے کہ انسان کسی امر کو خود اپنے ارادہ واختیار سے عمل میں لاتا اور ترک کرتا ہے یا خدا ہی کے ارادہ واختیار سے جبکہ ابھی اسی میں بحث باقی ہے تو دلیل مذکور کا قدم یہاں کس طرح آگے بڑھ سکتا ہے۔ اور اگر دوسری صورت ہے یعنی اس کے علم میں یہ گذرا ہے کہ بندہ خود اپنے اختیار و

ارادہ سے ایمان نہ لائیگا تو اس سے ایمان کا اسکی طاقت سے باہر ہونا لازم نہیں آتا۔ بلکہ بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ اسکو طاقت وقدرت ایمان حاصل ہے لہٰذا اس کا حکم تکلیف مالایطاق نہ ہوگا۔ رہا یہ امر کہ اگر خلاف علم الٰہی بندہ ایمان قبول کرلے تو اسکا علم جہل سے بدل جائے گا۔ تو اسکا جواب یہ ہے کہ بے شبہ علم خدا کے خلاف نہ ہوگا۔ مگر اس سے یہ نہیں کہ اسکا علم بندہ کو مجبور کر دے۔ اور قبول ایمان کے اوپر اسکو قدرت باقی نہ رہے۔ کیونکہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ علم خدا کے سبب سے کسی امر کا وقوع واجب ہو جاتا ہے اس کے خلاف کرنے پر قدرت وطاقت باقی نہیں رہتی۔ تو پھر خود خداوند عالم کے کاموں میں بھی یہ ماننا پڑیگا۔ یعنی جن امور کے واقع ہونے کا اسکو علم ہوا ہے ان کا وقوع واجب ہوگا۔ ان کے خلاف کرنے پر اسکو قدرت نہ ہوگی۔ ورنہ اسکا علم جہل سے بدل جائے گا۔ اور اس صورت میں تو ایک کے بجائے دو محال لازم آتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ خداوند عالم اپنے کاموں کے نہ کرنے ہی پر بے اختیار نہیں ٹھہرتا بلکہ ان کے فعل کے لحاظ سے بھی فاعل موجب (یعنی فاعل بے اختیار) قرار پاتا ہے کیونکہ جن امور کا واقع ہونا لازم وواجب ہوتا ہے انہیں قدرت کو تاثیر کی گنجائش نہیں ہوتی تو وہ خود بخود بغیر کسی تاثیر کی مداخلت کے واقع ہو کر رہتے ہیں کیونکہ قدرت کا تعلق تو انہیں امور سے ہوتا ہے جنکا وجود یا عدم ضروری نہیں ہوتا یعنی دونوں پہلو برابر ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دیکر واقع کر دیتی ہے۔

(تیسری دلیل) جن لوگوں کی بابت خداوند عالم نے خبر دی ہے کہ وہ ایمان قبول نہ کریں گے وہ لامحال ایمان کے مکلف بھی ہیں۔ ایسا نہیں کہ اس خبر کے بعد اُن سے یہ تکلیف اٹھالی گئی ہو۔ اور ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ جتنی باتوں کی خدا نے خبر دی ہو۔ ان میں سے ہر ایک کی تصدیق کی جائے پس اس خبر پر بھی (کہ وہ ایمان نہ قبول کریگا۔) ایمان لانے کا مکلف ہوگا۔ اور اس طرح اس سے یہ تکلیف متعلق ہو جائے گی۔ کہ نفی واثبات یعنی ایمان وعدم ایمان کو ایک ساتھ جمع کر دے۔ اور یہ ایسی تکلیف ہے جو اسکی طاقت سے باہر ہے۔

(جواب) اس استدلال کی بنیاد محض اس فرض پر قائم ہے کہ یہ خبر بھی اُن کفار کے سامنے مثل دیگر اخبار سابقہ کے بغرض تصدیق پیش کی گئی ہو۔ اور یہ امر قابل تسلیم نہیں کیونکہ یہ خبر محل عتاب وعقاب میں دی گئی تھی۔ اور خداوند عالم کے غضب کو ظاہر کر رہی تھی۔ لہٰذا یہ ثابت ہو جانے کیلئے کھلا ہوا قرینہ موجود ہے کہ اسکو رسولؐ سے بیان کرنے کا مقصود فقط یہ تھا کہ کفار کی طرف سے مایوس ہو کر اپنے دل کو مطمئن کرلیں۔ نہ یہ کہ اسکو ان کے سامنے پیش کرکے تصدیق طلب کریں۔ پس نہ وہ اس خبر کی تصدیق پر مامور تھے۔ اور نہ کسی دوسری خبر کی تصدیق پر خواہ وہ اس سے پہلے دی جا چکی ہو۔ یا بعد میں دی جانے والی ہو۔ بلکہ ہر طرح کے احکام

واخبار کی تبلیغ کا سلسلہ ان سے قطع کر لیا گیا تھا۔ اور اسکا مطلب یوں سمجھنا چاہیئے کہ جب کوئی آقا اپنے غلاموں کو ایک مدت دراز تک اپنے احکام طرح طرح کے وعدہ ووعید کے ساتھ دیتا رہتا ہے۔ اور ان کو اپنے نفع وضرر کے ہر ہر پہلو کو سوچنے سمجھنے کیلئے کافی مہلت بھی دیتا ہے۔ مگر وہ اپنی سرکشی ونافرمانی سے باز نہیں آتے تو آخر کار غضبناک ہو کر اپنے احکام واوامر۔ مواعظ ونصائح کا سلسلہ قطع کر دیتا ہے۔ اور ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دیتا ہے تاکہ اسی سرکشی ونافرمانی میں مبتلا رہ کر پوری سزا کے مستحق ہو جائیں۔ پس خداوند عالم کی طرف سے بھی بندوں کے ساتھ ہر زمانہ میں ایسا ہی معاملہ کیا جاتا رہا ہے۔ یعنی کافی مدت ومہلت دیکر پہلے راہ ہدایت ان کو دکھائی جاتی تھی۔ اور جب وہ کسی طرح اصلاح حال پر آمادہ نہ ہوتے تھے تو تبلیغ کا سلسلہ قطع کرکے معذب کر دیئے جاتے تھے۔ پس عہد حضرت خاتم النبیین میں بھی حد درجہ سرکش کفار کے ساتھ ایسا ہی کیا گیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ انبیاءؑ سابقین کی امتیں طرح طرح کے عذاب نازل کرکے ہلاک کر دی گئیں۔ اور یہاں عتاب کے طور پر اخبار الٰہیہ واحکام ربانیہ کو ان کے سامنے پیش کرنے کا سلسلہ قطع کر دینے ہی پر اکتفا کی گئی۔ اور عذاب وعقاب کو خداوند عالم نے آخرت پر اٹھا رکھا اور اسکا سبب یہ ظاہر فرمایا ما کان اللّٰہ لیعذبھم وانت فیھم یعنے اے رسولؐ! جب تک تم ان کے درمیان ہو۔ ہم انپر عذاب نازل نہیں کریں گے۔ اس مطلب کا ثبوت اکثر آیات قرآنی سے مل سکتا ہے۔ جن میں چند آیتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں

(۱) وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَاهۡجُرۡهُمۡ هَجۡرًا جَمِیۡلًا ۝ وَذَرۡنِیۡ وَالۡمُکَذِّبِیۡنَ اُولِی النَّعۡمَۃِ وَمَهِّلۡهُمۡ قَلِیۡلًا ۝

اور صبر کرو ان باتوں پر جو وہ کہتے ہیں اور ان سے اچھے عنوان سے کنارہ کش ہو جاؤ اور دولتمند جھٹلانے والوں کو میرے اوپر چھوڑ دو اور ان کو تھوڑی مہلت دے دو۔

اس طرح کی آیتوں کا صریح مفہوم یہی ہے کہ اے رسولؐ تم ان کفار سے سلسلۂ ہدایت قطع کرکے الگ ہو جاؤ۔ اور مجھے ان سے سمجھ لینے دو۔ مگر ابھی تھوڑی سی مہلت دیدو۔

(۲) سَاَصۡرِفُ عَنۡ اٰیٰتِیَ الَّذِیۡنَ یَتَکَبَّرُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ ؕ

جو لوگ ناحق زمین پر اکڑتے ہیں ان کے رخ کو میں نشانیوں کی طرف سے موڑ دوں گا۔

اس آیت میں خداوند عالم نے جناب موسیٰؑ کی زبانی ان کی قوم کے متکبروں کو متنبہ کیا تھا کہ ہم ان سے عنقریب اپنی آیتوں کے اظہار کا سلسلہ قطع کر دیں گے۔ اور یہ تنبیہ اس وقت کی گئی تھی جبکہ ابھی آیات ومعجزات کے اظہار کا سلسلہ جاری تھا۔ پس اسکو بند کر دینا بعینہ سلسلۂ ہدایت کا قطع کر دینا اور تکلیف کا اٹھا لینا ہے۔

(۳) وَأُوحِيَ إِلَىٰ نُوحٍ أَنَّهُ لَن يُؤْمِنَ مِن قَوْمِكَ إِلَّا مَن قَدْ آمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا

اور نوح کی طرف وحی کی گئی کہ جو ایمان لا چکے ہیں ان کے علاوہ اب تمہاری قوم میں سے کوئی ایمان نہیں لائے گا۔ لہٰذا جو کچھ وہ کرتے ہیں اسکا غم نہ کرو اور کشتی کو ہمارے پیش نظر اور مطابق وحی تیار کرو۔"

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ جناب نوحؑ کو خداوند عالم نے یہ خبر دی تھی کہ جو لوگ ان کی قوم میں سے ایمان لا چکے ہیں۔ اب ان کے سوا کوئی ایمان نہ لائے گا۔ لہٰذا اب وہ ان کے اعمال کا غم نہ کھائیں۔ اور ان کی فکر ہدایت چھوڑ کر کشتی بنانے میں مصروف ہو جائیں۔ لہٰذا اس خبر کا یہ مقصود ہرگز نہیں تھا۔ کہ اس کو ان ایمان لانے والوں تک پہونچا کر تصدیق کے طالب ہوں۔ بلکہ آیت کی لفظیں خود بتا رہی ہیں کہ مقصود صرف یہ تھا کہ جناب کو جو حزن و غم اپنی قوم کی بداعمالی سے رہتا تھا اسکو دفع کیا جائے۔ اور کہہ دیا جائے کہ اب انکا معذب ہونا خدا کے نزدیک طے پا چکا ہے۔ لہٰذا فکر ہدایت نہ کریں۔ پس اسی پر ان خبروں کو بھی قیاس کرنا چاہیئے جو خاتم النبیینؐ کو آپ کے عہد کے بعض انتہا درجہ کے سرکش کافروں کی بابت دی گئیں چونکہ یہ مسئلہ نہایت ضروری اور فی الجملہ دقیق بھی تھا۔ اس لئے اسے تفصیل سے لکھا تاکہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ اس معاملہ میں حق کس کے ساتھ ہے۔

بالجملہ خدا کی خبر اور اسکا علم بندوں کو ایمان قبول کرنے سے مانع نہیں ہوتا اور اس پر علاوہ ان عقلی دلیلوں کے جو اوپر مذکور ہو چکیں بہ کثرت آیات قرآنی بھی دلالت کرتی ہیں۔ ان میں سے چند آیتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں۔ باقی طرف ان کے مواقع میں اشارہ کیا جائیگا۔"

(۱) وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَن يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ۔

اور کس چیز نے لوگوں کو ایمان لانے سے روک دیا جبکہ ان کے پاس خصوصی ہدایت آ چکی تھی

اس آیت میں زجر و توبیخ کے طور پر یہ سوال کیا گیا ہے کہ آخر لوگوں کو قبول ایمان سے کون سا امر مانع ہے پس اگر خدا کی خبر یا اسکا علم مانع ہوتا ہو تو یہ سوال کسی طرح مناسب نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی آقا اپنے غلام کو کسی مکان میں مقید کر دے اور پھر اس سے پوچھے کہ تجھے میری خدمت بجا لانے سے کون سا امر مانع ہے تو اہل عقل کے نزدیک یہ سوال نہایت قبیح ہوگا۔ لہٰذا آیت نے ثابت کر دیا کہ خدا کی طرف سے کوئی امر بندوں کیلئے مانع ایمان نہیں۔

(۲) وَلَوْ أَنَّا أَهْلَكْنَاهُم بِعَذَابٍ مِّن قَبْلِهِ لَقَالُوا رَبَّنَا لَوْلَا أَرْسَلْتَ إِلَيْنَا رَسُولًا فَنَتَّبِعَ

اور اگر ہم ان کو اس رسول کے پہلے عذاب سے ہلاک کر ڈالتے تو ضرور کہتے کہ اے ہمارے پالنے والے تو نے

آيَاتِكَ مِن قَبْلِ أَن نَّذِلَّ وَنَخْزَىٰ۔

ہمارے پاس (اپنا) رسول کیوں نہ بھیجا تاکہ ہم اپنے ذلیل و رسوا ہونے سے پہلے تیری آیتوں کی پیروی کرتے۔"

(۳) رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ

ایسے رسول جو کہ بشارت دینے والے اور خوف دلانے والے تھے تاکہ ان رسولوں کے بعد خدا پر ان کی کوئی حجت باقی نہ رہے۔"

ان دونوں آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے اپنی حجت بندوں پر تمام کر دی ہے اور کوئی عذر ان کے لئے باقی نہیں چھوڑا ہے جس کو وہ اسکے سامنے پیش کر سکیں۔ پس جبکہ علم و خبر الٰہی مانع ایمان ہوں تو اس سے زیادہ قوی عذر ان کے لئے اور کیا ہوگا۔ اور اگر وہ کہیں کہ خدایا تیرے علم اور تیری خبر ہی نے ہم کو مجبور کر دیا ورنہ ہم ایمان قبول کر لیتے تو بجائے اس کے کہ خدا کی حجت بندوں پر تمام ہو خود اس کو بندوں کی حجت کے مقابلہ میں خاموش ہو جانا پڑے گا۔

خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ

ترجمہ۔ خدا نے انکے دلوں اور کانوں پر علامت لگا دی۔ (کہ اب یہ ایمان نہ لائینگے۔ اور ان کی آنکھوں پر پردہ (پڑا) ہے اور انھیں کے لئے بڑا عذاب ہے۔"

اس آیت کی صحیح تاویل بیان کرنے سے پہلے یہ ظاہر کر دینا لازم ہے کہ انسانی افعال کی بابت شیعہ امامیہ کی رائے یہ ہے کہ وہ خود انسان کے اختیار و ارادہ سے واقع ہوتے ہیں۔ خدا کے ارادہ کو اس کے کاموں میں دخل نہیں ہوتا۔ اور اس پر وہ متعدد دلیلیں پیش کرتے ہیں جن میں سے چند یہاں نقل کی جاتی ہیں

(پہلی دلیل) انسان کا فاعل مختار ہونا ایسا بدیہی ہے کہ اس کو چھوٹے چھوٹے بچے بھی جانتے ہیں گویا اسکا احساس انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی بچہ کو لکڑی یا پتھر سے تکلیف پہونچائے تو وہ اس لکڑی اور پتھر کی مذمت نہیں کرتا۔ بلکہ اس شخص کی مذمت کرتا ہے جس نے تکلیف پہنچائی ہے۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اسی لئے تو کہ اس بچے کے نزدیک بھی اس شخص کا اختیار اور لکڑی اور پتھر کی بے اختیاری بدیہی ہے۔

(دوسری دلیل) اگر انسان کا فاعل مختار ہونا بدیہی نہ ہوتا تو مختلف فعلوں کے طلب کرنے میں فرق کرنا صحیح نہ ہوتا۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو ایک مرتبہ کھڑے ہونے یا بیٹھ جانے کا حکم دے اور دوسری مرتبہ آسمان کی جانب اڑ جانے کا۔ تو ہر عاقل ان دونوں حکموں میں فرق کرکے ایک کو مقدور اور دوسرے کو انسانی طاقت سے باہر سمجھتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک شخص کے ہاتھ رعشہ کے سبب

حرکت میں ہوں اور دوسرے کے بغیر کسی آفت و مرض کے متحرک ہوں تو ہر صاحبِ عقل دیکھتے ہی یہ تمیز کر لیتا ہے کہ ان میں سے ایک کی حرکت اضطراری ہے اور دوسرے کی اختیاری۔"

(تیسری دلیل) اگر انسان کے تمام افعال کا فاعل خداوند عالم ہو تو اس صورت میں اس کا صرف بدکار ہونا ہی نہیں بلکہ رسولوں کی بعثت اور تکالیف شرعیہ سب کی سب محض بے فائدہ قرار پائیں گی۔ اور وہ جزا جو بروز قیامت دیگا سراسر ظلم و ناانصافی ٹھہرے گی۔ نیز بندوں میں سے بعض اسکی عبادت کرتے ہیں اور بعض اس کی شان میں سوءِ ادب کے مرتکب ہوتے ہیں جس کو خود اسی نے ان شکوہ آمیز لفظوں میں ظاہر فرما دیا ہے۔ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (یعنی جن لوگوں نے خدا کی قدر جیسی چاہیے نہیں کی) پس اگر ان سب کاموں کا کرنے والا خود وہی ہو تو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ خود اپنی عبادت کرتا ہے اور خود ہی اپنی ذات پاک کو برا بھلا کہتا ہے اور پھر الٹی بندوں کی شکایت کرتا ہے اور ان کو جہنم میں بھی ڈال دینے پر تیار رہے عقل والے سمجھ سکتے ہیں کہ بھلا اس سے بھی زیادہ خلاف حکمت بات کوئی اور بھی ہو سکتی ہے؟

(چوتھی دلیل) اگر بندہ کا فاعل مختار ہونا تسلیم نہ کیا جائے تو لازم آئے گا کہ (نعوذ باللہ) خدا ان کو شیطان سے بھی زیادہ ضرر پہونچانے والا ہو اسلئے کہ شیطان فقط بہکاتا اور برے کاموں کیطرف رغبت دلاتا ہے کسی کام پر ان کو مجبور نہیں کرتا بخلاف اس کے خدا تو اپنی طاقت سے ہر برے کام پر مجبور کر دیتا ہے۔ بلکہ اس صورت میں تو شیطان بالکل بے قصور و بے ضرر ٹھہرے گا کیونکہ وہ بھی خدا ہی کا ایک بندہ ہے جسکا اپنے کاموں میں مجبور ہونا فرض کیا گیا ہے۔

ان عقلی دلیلوں کے علاوہ بہت سی آیتیں قرآن مجید کی صاف و صریح لفظوں میں بتاتی ہیں کہ انسان اپنے کاموں کو محض اپنے اختیار سے کرتا ہے خدا اسکو کسی طرح مجبور نہیں کرتا۔ ان میں سے چند آیتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

(۱) فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۔ پس جسکا جی چاہے ایمان لائے اور جسکا جی چاہے کفر اختیار کرے

(۲) اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ۔ جو جی چاہے کرو۔ تمہارے عمل کا اللہ اور رسول اللہ عنقریب جائزہ لینگے۔

(۳) سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا ۔ عنقریب مشرک کہیں گے کہ اگر خدا چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے۔

اس آیت میں خدا نے ان مشرکین کی مذمت اور تکذیب کی ہے جو اپنے شرک کو خدا ہی کا فعل بتاتے تھے پس اگر فی الحقیقۃ وہی فاعل ہو تو خود اپنی مذمت و تکذیب کرنے والا قرار پائے گا۔

(۴) اِنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۔ (ترجمہ) یقیناً خدا شرک کرنے والوں سے بری ہے

اس آیت میں خدا نے کفار سے اپنا بری ہونا ظاہر کیا ہے۔ حالانکہ اگر کفر و شرک کا خالق وہی ہو تو

فی الحقیقۃ ہرگز بری نہیں ہو سکتا۔ اور یہ برأت ظلم بالائے ظلم قرار پائے گی۔

دفع دخل

اس مقام پر اگر یہ کہا جائے کہ قرآن میں بہت سی آیتیں ایسی بھی ہیں جن سے جبر کا ثبوت ملتا ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ کا تمہاری رائے کے مطابق طے ہونا دشوار ہے تو اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ قرآن کی راہ کبھی عقلِ سلیم کی راہ سے جدا نہیں ہو سکتی لہٰذا جو آیتیں اپنے ظاہری معنوں میں عقل صحیح کے حکم سے موافقت رکھتی ہوں انھیں پر انسان کو اپنے عقائد کی بنیاد رکھنی چاہیے۔ اور جن آیتوں کے ظاہری معنی خلاف حکم عقل ہوں۔ انکی تاویل واجب ہے۔ پس چونکہ ہم نے متعدد دلائل عقلیہ سے ثابت کر دیا ہے کہ بندہ اپنے کاموں میں مجبور نہیں۔ اور جبر کا عقیدہ عقلِ سلیم کے بالکل خلاف ہے کیونکہ اس سے ایسی خرابیاں لازم آتی ہیں جو خدائے تعالیٰ کیطرف منسوب نہیں کی جا سکتیں۔ لہٰذا جن آیتوں کے ظاہری معانی ان دلائل عقلیہ کے خلاف ہوں ان کی بابت یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ مقصود پروردگار عالم نہیں ہو سکتے۔

مزید حل

ممکن ہے کہ کسی کے لیے یہ بیان بھی باعث اطمینان قلب نہ ہو اور وہ کہے کہ جو لوگ جبر کے قائل ہیں وہ بھی اپنے دعوے پر عقلی دلائل پیش کرتے ہیں اور ظاہری مفہوم سے جبر پر دلالت کرنے والی آیات کو انھیں کے مطابق بتاتے ہیں۔ اور جن آیتوں سے انسان کا فاعل مختار ہونا ظاہر ہوتا ہے ان کے نزدیک وہی تاویل کے قابل ہیں لہٰذا امر حق کا معلوم ہونا اب بھی دشوار ہی رہا۔ تو اسکا جواب یہ ہوگا کہ ہمارے بیان سے یہ ثابت ہو گیا کہ انسان کا فاعل مختار ہونا بدیہی امر ہے پس جو استدلال بدیہی کے مقابلہ میں پیش کیا جائے وہ استدلال نہیں بلکہ ناقابل التفات شبہ ہوگا۔ چنانچہ جن شبہات و مغالطات کو دلیل کے نام سے بیان کیا گیا ہے ان میں سب سے زیادہ قوی وہی تھے جن کی غلطی اوپر ظاہر کر دی گئی باقی ماندہ میں سے قوی تر شبہ جس کے بنا پر عقیدہ جبر کی ابتدا ہوئی یہ ہے کہ اگر بندہ کا فاعل مختار ہونا فرض کیا جائے تو لازم آئے گا کہ وہ فعل و خلق میں خدا کا شریک ہو۔ لیکن خدا کے لئے شریک کا ہونا محال ہے۔ لہٰذا اسکا فاعل مختار ہونا باطل ہوگا۔ اور اس شبہ کا ضعیف اور لغو ہونا ظاہر ہے کیونکہ اگر شریک ہونے سے خدا اور بندہ کا مل جل کر کسی کام کو کرنا مراد ہے تو اسکا باطل ہونا مسلم ہے مگر یہ کسی کا دعویٰ نہیں اور اگر شریک ہونے سے یہ مراد ہے کہ خدا اپنے کاموں کو اور بندہ اپنے کاموں کو انجام دیتا ہے تو اس صورت میں شریک ہونے کا دعویٰ محض بے معنیٰ ہے اور اگر یہ مراد ہے کہ محض مفہوم فاعلیۃ میں بندہ خدا کا شریک ہو جائیگا خواہ دونوں کے کاموں میں زمین و آسمان کا فرق کیوں نہ ہو۔ تو اس صورت میں کوئی خرابی لازم نہیں آتی کیونکہ خداوند عالم نے خود بہت سے الفاظ مثلاً رحیم۔ رؤف۔ حلیم۔ علیم وغیرہ کو دوسروں پر بھی اطلاق کیا ہے۔ اور بندوں کو ان کے والدین کے حق میں یہ دعا رَبِّ ارْحَمْهُمَا

كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا تعلیم کی ہے۔ جس سے مفہوم تربیت میں والدین خدا کے شریک ٹھہرتے ہیں۔ پس
محض مفہوم میں شریک ہونا برا سمجھا جائے تو اس برائی کا الزام خدا پر بھی قائم ہو جائے گا۔

بالجملہ جبکہ یہ امر بخوبی ثابت ہوا کہ خداوند عالم کسی فعل پر بندوں کو مجبور نہیں کرتا تو آیہ ختم اللہ
نیز ایسی ہی دیگر آیات کی بابت یہ یقین کر لینا چاہیے کہ ان کے حقیقی معنی وہ نہیں ہیں جو قائلین جبر اور مخا
اسلام نے سمجھے ہیں۔ بلکہ ان کی صحیح تاویل یہ ہے کہ یہ آیتیں مخصوص ان کفار کی بابت نازل ہوئی ہیں جو
تکذیب رسول میں نہایت سخت تھے۔ اور خدا کے عتاب وعقاب کو ظاہر کر رہی ہیں یعنی جبکہ ہر طرح ہدایت
مراتب طے کر دئے گئے ہیں اور ایک مدت دراز تک ان کو مہلت دیدی گئی ہے کہ اپنے حالات کی ا
کریں۔ مگر انھوں نے کفر و شرک کا راستہ نہ چھوڑا۔ تو خدا نے ان کو دنیا ہی میں یہ سزا دی کہ ان کے
پر مہر لگا دی گویا سمجھنے اور ہدایت پانے کی قوت سلب کر لی اور اسکی مثال یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل کو
عالم کی طرف سے بار بار تاکیدی حکم دیا گیا کہ کفار شام سے لڑ کر ان کے ملک میں داخل ہو جائیں اور
طور سے بتا دیا گیا کہ اس ملک کی حکومت ان کے لئے مقدر ہو چکی ہے لہٰذا وہ وہاں کی سرزمین پر قدم
ہی غالب آجائیں گے مگر انھوں نے اپنی سرکشی سے قطعاً انکار کر دیا۔ اور کسی طرح لڑنے پر آمادہ
تو خداوند عالم نے چالیس سال کے لئے ان کو سخت حیرانی میں مبتلا کر دیا۔ اور وہ یہ کہ صرف پندرہ کوس
مسافت میں دن بھر چلتے چلتے جب شام کو ٹھہرتے تو معلوم ہوتا تھا کہ صبح کو جہاں سے چلے تھے، پھر وہیں
گئے ہیں۔ یہ قصہ آئندہ تفصیل سے معلوم ہوگا۔ بالجملہ آیہ زیر بحث اور اس کے مثل دیگر آیات میں یہ مراد نہیں
ہے کہ خداوند عالم کا روکنا کفار کے ایمان نہ لانے کا سبب ہوا۔ بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ ان کے کفر و تکذیب
کے استمرار کے سبب خدا نے غضبناک ہو کر ان کے دلوں سے ایمان کی صلاحیت آئندہ کیلئے سلب کر لی

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ ترجمہ:- اور
بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو (زبان سے تو) کہتے ہیں کہ ہم خدا پر اور قیامت پر ایمان لائے، حالانکہ وہ
دل سے ایمان نہیں لائے۔"

(۱) پروردگار عالم نے پہلی پانچ آیتوں میں مومنین و متقین کا ذکر فرمایا۔ پھر دو آیتوں میں ان
کا ذکر کیا جو کافر محض تھے۔ یعنی دلی انکار کیساتھ زبان سے بھی منکر تھے ان کے بعد تیرہ آیتوں میں ان لوگوں
کے حالات بیان کئے جن کا ظاہر و باطن یکساں نہ تھا۔ زبان سے مومن ہونے کا اقرار کرتے تھے مگر دل میں
مخفی رکھتے تھے۔ انکا سرغنہ عبداللہ بن ابی تھا۔ چونکہ یہ لوگ اسلام کے نہایت خطرناک دشمن تھے اور
لئے کہ اظہار ایمان سے انکا منشا یہ تھا کہ مسلمانوں میں مل جل کر ان کے مخصوص حالات اور خفیہ اسرار کو معلوم

اور ان کے دشمن کفار تک پہونچا دیں۔ لہٰذا پروردگار عالم نے ان کے مخفی حالات اور دلی کیفیات کو متعدد
مواقع پر پوری تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔

(۲) اس آیت نے یہ بھی بتایا کہ محض زبانی اقرار سے کوئی شخص مومن نہیں ہوتا بلکہ ایمان کے لئے دلی اعتقاد
شرط ہے۔

يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۝ ترجمہ
(یہ لوگ) خدا کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لا کے دھوکا دیتے ہیں حالانکہ وہ خود اپنے کو دھوکا
دیتے ہیں اور شعور نہیں رکھتے۔)

(۱) منافقین کا طرز عمل خود بتا رہا ہے کہ وہ خدا کو پوشیدہ ارادوں اور نیتوں کا عالم نہیں جانتے
تھے۔ اور نہ اسکو مخفی اقوال و افعال کا سننے اور دیکھنے والا سمجھتے تھے۔ ورنہ ان کو منافقانہ حرکات پر
جرات ہی نہ ہوتی۔ پس انکا مقصود درحقیقت خدا کو فریب دینا تھا۔ اور وہ اسکو اس قابل سمجھتے تھے
کہ فریب دیا جا سکے۔ لہٰذا "يُخَادِعُونَ اللَّهَ" کہنے کا مقصد محض ان منافقین کے ارادہ اور خیال کا اظہار
ہے جس کی غلطی بعد میں "وَمَا يَخْدَعُونَ الخ" فرما کر ظاہر کر دی۔ اور صاف طور سے بتا دیا کہ وہ فریب دئے
جانے کے قابل نہیں۔ لہٰذا درحقیقت یہ لوگ نادانستہ خود اپنے نفوس کو فریب دے رہے ہیں۔ کیونکہ
اسکا انجام ان کے حق میں برا ہوگا۔

نیز آیت میں فقط اتنا ہی کہا ہے کہ منافقین خدا اور مومنین کو فریب دینا چاہتے ہیں۔ رسولؐ کا ذکر
نہیں کیا۔ حالانکہ انکا مقصود یہ بھی تھا کہ رسولؐ کو فریب دیں۔ پس ممکن ہے کہ جسطرح "آیہ مَن يُطِعِ
الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ" میں خداوند عالم نے رسول کی اطاعت کو خود اپنی اطاعت قرار دیا ہے اسی طرح
اس آیت میں یہ ظاہر فرمایا ہو کہ رسولؐ کو فریب دینا خود خدا کو فریب دینا ہے

فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ
ترجمہ:"ان لوگوں کے دلوں میں مرض تھا ہی اب خدا نے ان کے مرض کو اور بڑھا دیا اور چونکہ
وہ لوگ جھوٹ بولا کرتے تھے اس لئے ان کے واسطے تکلیف دہ عذاب ہے۔"

بعض لوگوں نے "مرض" کی تفسیر "کفر" سے کی ہے اور آیت کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ انکے دلوں میں
کفر پہلے ہی سے تھا اب خدا نے اسکو اور زیادہ کر دیا ہے۔" لیکن یہ محض غلطی ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو جو کفار
منافقین شب و روز اسی کے درپے رہتے تھے کہ کوئی وجہ طعن انکے ہاتھ آجائے جس سے رسولؐ پر غالب آسکیں
اس آیت کو سن کر یقیناً یہ کہنے سے نہ چوکتے کہ جب خدا ہی ہمارے کفر کو بڑھا رہا ہے تو ہمارا کیا قصور؟ اور

ہم سے ایمان کی طلب کیسی ہے؟ اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں رسولؐ خدا کو خاموش ہو جانا ہی پڑتا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ اس آیت میں جس مرض کا ذکر ہے اس سے کفر مراد نہیں ہے بلکہ مقصود کچھ اور ہے جسکو وہ منافقین خوب سمجھ گئے تھے اور اسی لئے دم نہ مار سکے۔ اور اسکی تفصیل یہ ہے کہ کتب تواریخ سے معلوم ہوسکتا ہے کہ منافقین کے نفاق کا سبب یہ تھا کہ وہ رسولِ خدا کے وارد مدینہ ہونے سے پہلے اپنے لئے امارات و ریاست کے خواہاں تھے اور چونکہ آپ کی تشریف آوری سے ان کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ اس لئے آپ کی طرف سے ان کے قلوب بغض و حسد سے بھر گئے اور روز بروز جسقدر آپ کا حلقۂ اثر وسیع ہوتا جاتا تھا اسی قدر اس بغض و حسد میں زیادتی ہوتی جاتی تھی۔ اور اس کا سبب خود خداوند عالم ہو رہا تھا۔ کیونکہ اسی کی تائید و نصرت سے اسلام و بانئ اسلام کو روز افزوں قوت و ترقی حاصل ہو رہی تھی۔ پس مقصود آیت یہ ہے کہ ان منافقین کے دلوں میں مرض حسد پہلے ہی موجود تھا۔ اب خدا نے رسولؐ کے اقتدار کو اپنی تائید سے ترقی دیکر اس مرض کو اور بڑھا دیا۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ۝ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ۝ ترجمہ "اور جب ان سے کہا جاتا کہ ملک میں فساد نہ کرتے پھرو، تو کہتے کہ ہم تو صرف اصلاح کرتے ہیں خبردار ہو جاؤ، بیشک یہی لوگ فسادی ہیں۔ لیکن سمجھتے نہیں۔"

اگرچہ خداوند عالم نے اہل اسلام کو ان منافقین کے نام نہیں بتائے لیکن ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنکا نفاق حد سے بڑھ کر چھپنے کے قابل نہیں رہ گیا تھا۔ اس لئے اہل اسلام ان کو پہچاننے لگے تھے اور وہ ان کو کفار سے میل جول رکھنے سے منع کرتے تھے۔ اس پر وہ منافقین یہ کہتے تھے کہ ہمارا مقصود اس طرزِ عمل سے یہ ہے کہ اہلِ اسلام اور کفار کے درمیان تعلقات کی اصلاح کریں۔ کفار سے ارتباط رکھنے کو "فساد فی الارض" سے اس لئے تعبیر کیا ہے کہ انکا مقصود اصلی اس سے یہی تھا۔ کہ کفار کو اہلِ اسلام کے اسرار پر مطلع کر کے ان سے لڑنے اور غالب آنے کا موقع بہم پہونچائیں۔

پروردگار عالم کے اس ارشاد أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ الخ میں وہ شر و فساد مراد نہیں ہے۔ جس کے وہ درپے رہتے تھے۔ کیونکہ وہ ان کا ارادی فعل تھا۔ لہٰذا اس سے بے خبر کیونکر ہو سکتے تھے۔ پس اس کلام سے ان کے مخفی ارادوں اور خیالوں کی غلطی ظاہر کرنا مقصود ہے اور وہ یہ کہ کفار اور اہلِ اسلام کے درمیان شر و فساد کی آگ بھڑکا کر اپنے دین کی حمایت اور اپنی حالتوں کی اصلاح کریں۔ اور فریقین کے نزدیک انکا اعتبار و وقار بھی قائم رہے۔ لہٰذا خداوند عالم نے ان کو متنبہ کیا کہ وہ بجائے اصلاح اپنے

حال کو خود بدتر بنا رہے ہیں۔ کیونکہ اہلِ اسلام کی طرح کفار بھی ان کو بری نظروں سے دیکھتے اور بے اعتبار سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ خود اسکو محسوس نہیں کرتے

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۗ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ ۝ ترجمہ "اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جسطرح اور لوگ ایمان لائے ہیں تم بھی ایمان لاؤ تو کہتے ہیں کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لائیں جس طرح اور بے وقوف ایمان لائے۔ خبردار ہو جاؤ یہ خود بے وقوف ہیں لیکن جانتے نہیں۔"

ظاہر ہے کہ وہ رسولؐ اور مومنین کے سامنے اپنے ایمان کا اظہار کرتے اور نفاق کے چھپانے میں پوری احتیاط سے کام لیتے تھے۔ پس ان کے سامنے نہ ایمان سے انکار کر سکتے تھے اور نہ ان کو سفیہ و احمق بتا سکتے تھے لہٰذا یہ ماننا پڑے گا کہ اس آیت میں ان کی وہ گفتگو نقل کی گئی جو اپنے مقام پر آپس میں کیا کرتے تھے۔ اسی طرح اس کے بعد کی آیت میں بھی ان کے تخلیہ کی گفتگو کی حکایت کی گئی ہے۔ جس پر رسولؐ اور اہل اسلام کو بغیر اخبار الٰہی اطلاع نہیں ہو سکتی تھی۔ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں بلکہ اس علام الغیوب کا کلام ہے جس پر کوئی امر پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ ۝ اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ۝ "اور جب ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لاچکے تو کہتے ہیں کہ ہم تو ایمان لاچکے۔ اور جب اپنے شیطانوں کیساتھ تخلیہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔ اور ہم تو مسلمانوں کو بناتے ہیں (وہ کیا بنائیں گے) خدا ان کو بناتا ہے اور ان کو ڈھیل دیتا ہے کہ وہ اپنی سرکشی میں غلطاں و پیچاں رہیں۔"

(۱) اس آیت میں اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ کہنے کا یہ مقصود نہیں کہ درحقیقت خداوند عالم بھی ان کے ساتھ اسی طرح استہزاء کرتا ہے جس طرح وہ کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے استہزاء کی جزا اور بدلہ مراد ہے۔ اور یہ عرب کا بھی عام طور سے معمول تھا کہ کسی شے کی جزا کو اسی کے نام سے ذکر کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے

قَالُوا اقْتَرِحْ شَيْئًا نُجِدْ لَكَ طَبْخَهُ ۔۔۔ قُلْتُ اطْبُخُوا لِي جُبَّةً وَقَمِيصًا

یعنی لوگوں نے مجھ سے کہا کہ کسی چیز کی فرمائش کرو تو ہم اسے عمدہ طور سے پکا دیں تو میں نے ان سے کہا کہ میرے لئے ایک جبہ اور ایک قمیص پکا دو۔" یہ شعر صنعتِ مشاکلہ کی مثال ہے ورنہ ظاہر ہے کہ جبہ و قمیص پکائے نہیں جاتے بلکہ سیئے جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ پہلے پکانے کا ذکر کیا جا چکا تھا۔ لہٰذا اسی لفظ کو

جبہ و قمیص تیار کرنے کیلئے استعمال کیا۔ بس اسی انداز پر خدا نے استہزاء کو اپنی طرف منسوب کر لیا ہے
(۲) یمدھم فی طغیانھم یعمھون کہنے سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم نے ان منافقین کی شدت کفر
و عصیان کے سبب ان سے اپنے وہ الطاف سلب کر لئے ہیں جن کو محض اپنے تفضل سے بندوں کو عطا کرتا
ہے۔ اور اب انکو خود ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ
وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ○ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ○

ان لوگوں کی مثل تو اس شخص کی سی ہے جس نے (رات کے وقت مجمع میں) بھڑکتی ہوئی آگ
روشن کی۔ پھر جب آگ کے شعلے نے اس کے گرد و پیش خوب اجالا کر دیا تو خدا نے ان کی روشنی
لے لی۔ اور انکو گھٹا ٹوپ اندھیرے میں چھوڑ دیا کہ اب انھیں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ یہ لوگ
بہرے گونگے اندھے ہیں۔ اپنی گمراہی سے باز نہیں آ سکتے۔"

منافقین اگرچہ درحقیقت کافر ہی تھے لیکن اظہار اسلام و ایمان کی وجہ سے تمام ظاہری احکام میں
عامہ مسلمین کے شریک بنا دئے گئے تھے۔ یعنی تمام دنیاوی معاملات میں جو برتاؤ عام طور سے مسلمانوں کے ساتھ
ہونا چاہیئے۔ وہی ان کے ساتھ بھی کیا جاتا تھا۔ مگر یہ رعایت فقط دنیا ہی میں تھی جو زندگی کے ساتھ تمام
ہو جانے والی تھی۔ مرنے کے بعد ان کو شدید ترین عذاب کا سامنا ہونے والا تھا۔ بس اس تمثیل میں
یہ دکھایا گیا ہے کہ جب ان منافقین نے ایمان کا اظہار کیا اور اس کے ظاہری احکام عام مسلمانوں کی طرح
ان کو بھی شامل ہوئے اور وہ ان سے فائدہ اٹھانے لگے تو خدا نے ان پر موت مسلط کر دی۔ جس سے وہ دنیا کے
ظاہری احکام اسلام ختم ہو گئے۔ اور وہ سراسر ظلمت عذاب میں پڑ کر اندھے ہو گئے۔ بالجملہ اس تمثیل میں
"روشن کی ہوئی آگ" سے مراد اسلام ہے۔ اور اطراف و جوانب میں پھیلے ہوئے "نور" سے مراد اسلام کے وہ
ظاہری احکام ہیں جو موت کے بعد برطرف کر دئے گئے۔ اور "ظلمات" سے عذاب آخرت مقصود ہے
جس میں پڑ جانے کے بعد آنکھ، کان، زبان یہ سب اعضاء بے قابو ہو گئے۔ اور ہدایت کی طرف واپسی کا
موقع جاتا رہا۔

أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ
مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ○ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ
أَبْصَارَهُمْ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ
لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ○ (ترجمہ)

یا ان کی مثل ایسی ہے جیسے آسمانی بارش۔ جس میں تاریکیاں گرج اور چمک ہو۔ موت
کے ڈر سے کڑک کے مارے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں۔ حالانکہ خدا منکروں
کو گھیرے ہوئے ہے۔ قریب ہے کہ بجلی ان کی آنکھوں کو چوندھیا دے۔ جب اُن کے
آگے بجلی چمکی تو اس روشنی میں چل کھڑے ہوئے اور جب ان پر اندھیرا چھا گیا تو ٹھٹھک کر
کھڑے ہو گئے۔ اور اگر چاہے اللہ تو لیجائے انکی سماعت و بصارت، بیشک اللہ ہر چیز
پر قادر ہے۔"

اس تمثیل میں "صَیِّب" سے مراد ایمان و ہدایت ہے۔ اور ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ سے وہ
پر مشقت تکالیف شرعیہ مراد ہیں۔ جنکا اٹھانا منافقین کو ناگوار تھا۔ (مثلاً صوم و صلوٰۃ و زکوٰۃ و جہاد وغیرہ)
اور حاصل تمثیل یہ ہے کہ جب خدا نے ایمان و ہدایت کی راہ کھول دی جس میں تکالیف شاقہ بھی تھیں تو
منافقین کی جانوں پر بن گئی۔ اور وہ خوف کے مارے بھاگنے لگے۔ مگر جب اسی اثنا میں کہیں دنیاوی
فوائد کی جھلک بھی نظر آئی (مثلاً کسی جنگ میں مسلمانوں کی فتح ہوئی اور مال غنیمت میں وہ بھی حصہ دار
بنے) تو ان کے قلوب اسلام کی طرف رغبت کرنے لگے۔ اور اگر کبھی اس کے خلاف نظر آیا تو پھر بدگمان
و حیران ہو کر ٹھٹھک گئے۔"

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ
الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ
مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ○

اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور ان لوگوں کو جو تم سے پہلے تھے
پیدا کیا۔ عجب نہیں کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ اسی خدا نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور
آسمان کو چھت بنایا۔ اور بلندی سے پانی برسایا۔ پھر اسی نے تمہارے کھانے کیلئے پھل
پیدا کئے۔ پس خدا کا ہمسر کسی کو نہ بناؤ۔ حالانکہ تم علم رکھتے ہو۔"

قرآن مجید کی جن خصوصیات پر نظر کرنے سے کوئی شخص (بشرطیکہ عقل سلیم اور جہل و تعصب سے خالی
دل و دماغ رکھتا ہو) اسکو کلام الٰہی مان لینے میں شک و شبہ نہیں کر سکتا۔ ان میں سے نہایت روشن
خصوصیت ایک یہ ہے کہ اس کی ہر لفظ اور ہر جملہ کو مقتضائے محل و مقام سے اتنی کامل مطابقت
حاصل ہے کہ اگر اس کو دوسرے لفظوں سے بدل دیا جاتا تو اصل مقصد بالکل فوت ہو جاتا۔ نیز نہایت
مختصر الفاظ میں متعدد مطالب عالیہ ایسی عدیم النظیر ترتیب کے ساتھ بیان کر دئے گئے جن سے بہتر متصور

نہیں ہو سکتے۔ اس کی تصدیق کے لئے یہی آیت کافی ہے۔ بشرطیکہ مندرجہ ذیل تفصیل پر صحیح نظر ڈالی جائے

(امر اول) مخاطبین کو تکلیف عبادت دینے میں اپنے اور ناموں کے بجائے "ربکم" فرمایا اور بعد میں یہ ظاہر کیا کہ وہی ان کا خالق و رازق ہے اور اس سے یہ بتا دینا مقصود ہے کہ ان پر اس کی عبادت کا بجا لانا اس لئے واجب ہے کہ وہی پالنے والا اور مالک ہے۔ اس نے محض اپنے تفضل سے نعمت وجود عطا کی اور وہ تمام نعمات مہیا کیں جن کے بغیر بقا ناممکن تھی۔ لہٰذا حکم عقل یہی ہے کہ اس منعم حقیقی کا شکر ادا کیا جائے۔ جس کا ذریعہ عبادت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ پھر اس کی عبادت سے منہ پھیر لینا یا اس کے ساتھ دوسروں کو شریک کر لینا کور دلی اور کور چشمی ہے۔ جبکہ یہ صاف طور سے ظاہر ہے کہ جن کو "ارباب" بنا رکھا ہے۔ ان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔

(دوسرا امر) یہ ہے کہ عبادت کیلئے معرفت لازم ہے اور وہ بھی جو دلائل کے ذریعہ حاصل ہوئی ہو۔ محض تقلیدی معرفت درحقیقت معرفت کہی جانے کے قابل نہیں ہوتی اور سب سے قوی دلیل وہی ہوگی۔ جو خود انسان کے نفس میں نظر آئے۔ کیونکہ اس میں شک و شبہ کی خلل اندازی بہت کم ہوتی ہے۔ اس کے بعد درجہ ان دلیلوں کا ہے جو موجوداتِ عالم پر نظر کر کے حاصل کی جائیں۔ لہٰذا حکم عبادت کیساتھ حصول معرفت کیلئے پانچ دلیلیں بھی بیان کر دیں۔ اور عقلِ انسانی سے ان کو جو قرب و بعد حاصل تھا اسی کے اعتبار سے ان کے بیان میں بھی ایک خاص ترتیب قائم کر دی مثلاً سب سے پہلے انسان کو خود اسکی خلقت پر متوجہ کیا۔ اس لئے کہ بہ نسبت دوسروں کے احوال کے خود اس کے حالات اس پر زیادہ ظاہر ہوتے ہیں۔ اسکے بعد دیگر ابنائے جنس کی خلقت کو اسکے سامنے پیش کیا۔ کیونکہ ہر شخص پر بہ نسبت تمام موجودات عالم کے اپنے ہم جنسوں کے حالات واضح تر ہوتے ہیں۔ پھر زمین کے احوال کو آسمان کے ذکر پر مقدم کیا۔ اس لئے کہ قریب تر ہونے کی وجہ سے اس کے حالات بہ نسبت آسمان آسانی سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ اور ان دونوں کے آثار یعنی مینہ برسنے اور پھلوں کے پیدا ہونے کو آخر میں بیان کیا۔ اور یہی مناسب تھا کیونکہ اثر اپنے موثر سے وجود میں متاخر ہوتا ہے۔ لہٰذا بیان بھی اسکا آخر ہی میں ہونا چاہیئے۔

دفع دخل یہاں پر یہ بھی معلوم کر لینا ضروری ہے کہ آیۂ زیر بحث کے جملہ "لعلکم تتقون" میں اور اس کے علاوہ دیگر آیات میں بھی کلمہ "لَعَلَّ" اور "عَسیٰ" استعمال کیا گیا ہے۔ جو اپنی وضع کے لحاظ سے امید و بیم کو ظاہر کرتا ہے۔ اور یہ حالت امید و بیم اسی وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ انجام کار پر اطلاع حاصل نہ ہو۔ لہٰذا مخالفین قرآن کی طرف سے اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے۔ کہ کیا خدا کو کسی

کام کے انجام پر اطلاع نہ تھی۔ جو اس کو لَعَلَّ وغیرہ کہنے کی ضرورت پڑی۔؟

اس کا جواب دو طریقوں سے ہو سکتا ہے۔

(اول) یہ کہ بے شک خداوند عالم کو ہر امر کا انجام معلوم ہوتا ہے لیکن جو لوگ اس کے کلام کے مخاطب ہیں ان کو معلوم نہیں ہوتا۔ اور ان کے لئے اکثر یہی مناسب ہوتا ہے کہ بجائے یقین دلانے کے امید و بیم کی حالت میں رکھا جائے خصوصاً طاعت و عبادت کے معاملہ میں زیادہ تر یہی مناسب ہے تا کہ بندہ طمع و خوف کی حالت میں اپنی طاعت و عبادت کو لائق قبول بنانے کی پوری کوشش کرتا رہے۔ پس اس کلمہ "لَعَلَّ" کو استعمال کرنے کی وجہ خدا کی ناواقفیت نہیں ہے بلکہ انسان کی لاعلمی ہے اور مقصود پروردگار عالم اس سے یہی ہے کہ وہ امید و بیم کی حالت میں رکھا جائے۔

(دوم) یہ کہ "لَعَلَّ و عَسیٰ" کہکر امید و طمع یہاں اس نے دلائی ہے جو ملک، رحیم و کریم ہے لہٰذا اگرچہ یہ لفظ اپنی وضع کے اعتبار سے محض امید دلاتی ہے۔ لیکن اسکے ساتھ ساتھ متکلم کی شان کرم و رحم اسکے پورا ہونے کا یقین بھی دلا رہی ہے جبکہ دنیا کا عام دستور ہے کہ امرا و سلاطین اپنے سچے وعدوں کو محض "لعل و عسیٰ" جیسے امید دلانے والے لفظوں میں ظاہر کرتے ہیں۔ اور سننے والوں کو اس کے پورا ہو جانے کا یقین ہو جاتا ہے۔ تو خداوند عالم نے انھیں لفظوں میں جو وعدہ فرمایا ہو اسکا پورا ہو جانا کیونکر یقینی نہ ہوگا۔

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ۝ (ترجمہ) "اور اگر تم لوگ اس کلام سے جو ہم نے اپنے بندے (محمدؐ) پر نازل کیا ہے۔ شک میں پڑے ہو۔ پس اگر تم لوگ سچے ہو تو تم (بھی) ایک ایسا ہی سورہ بنا لاؤ۔ اور خدا کے سوا جو تمہارے مددگار ہوں ان کو (بھی) بلا لو۔ پس اگر تم لوگ یہ نہیں کر سکتے ہو اور ہرگز نہیں کر سکوگے۔ تو اس آگ سے ڈرو جس کے ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے اور کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے۔"

یہ آیت اُن آیاتِ تحدی میں سے ہے جو ثابت کر رہی ہیں کہ قرآن مجید معجزہ رسول ہے اس کا مثل پیش کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ چونکہ اعجازِ قرآن کی مکمل بحث مقدمہ حواشی میں مذکور ہے لہٰذا ہم یہاں محض مختصر بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔"

اگر قرآن مجید کو عالم کے فصحا کے کلاموں کے مقابلہ میں دیکھا جائے تو چار حالتوں میں سے کوئی ایک حالت اس میں نظر آسکتی ہے۔ پانچویں کوئی صورت متصور نہیں ہو سکتی۔ یا تو وہ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے ان کے برابر ہوگا یا کم یا زیادہ۔ اور اس صورت میں اسکی زیادتی فقط اتنی ہوگی جتنی عام طور سے کلام فصحا میں پائی جاتی ہے۔ یا وہ زیادتی اس حد کو پہونچی ہوگی جو عادت کے خلاف نظر آئے گی۔ پس یہ معلوم کر لینے کیلئے قرآن مجید کی ان حالتوں میں سے کون سی حالت ہے۔ پہلے اسپر غور کرنا چاہیئے کہ اس کی متعدد آیات میں فصحاء عرب کے سامنے کیسے کھلی تحدی کی گئی ہے۔ اور تدریجاً یہانتک کہدیا گیا کہ پوری کتاب نہ سہی اگر اسکے مثل دس آیتیں یا ایک ہی سورہ پیش کردو تو تم اپنے اس خیال میں کہ قرآن کلام الٰہی نہیں ہے، سچے سمجھ لئے جاؤگے۔ اور کس طرح صاف اور صریح لفظوں میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ تم کیا اگر تمام جن و انس مل کر اسکی کوشش کریں تب بھی اس کے مثل پیش نہیں کر سکتے۔ اور پھر یہ دیکھنا چاہیئے کہ جن لوگوں سے یہ مطالبہ کیا گیا وہ قوانین فصاحت و بلاغت پر کامل اطلاع رکھتے تھے۔ اور ان کو اس پر اتنا ناز تھا کہ اپنے مقابلہ میں ساری دنیا کو عجم (گونگا) کہتے تھے۔ اور ان کی غیرت و حمیت، کبر و الف کی وہ حالت تھی جو دنیا کی کسی قوم میں موجود نہ تھی۔ اور وہ رات دن اسی فکر میں بسر کرتے تھے۔ کہ کسی طرح اپنے دین کی حمایت کریں اور اسلام کا نام و نشان مٹا کر رہیں۔ یہانتک کہ اسکے پیچھے انھوں نے اپنی جان و مال کا تلف ہو جانا بھی گوارا کر لیا اور ہر طرح کے خطرات میں پڑنے کے لئے آمادہ ہوگئے۔ اگر ان تمام امور کے اطراف و جوانب پر نظر سلیم ڈالی جائے تو یہ ماننا پڑیگا کہ قرآن مجید تمام سابقین و لاحقین فصحائے عرب کے کلاموں سے فصاحت و بلاغت میں اتنا بڑھا ہوا تھا کہ وہ اس کے ایک سورہ کا مثل بھی نہیں پیش کر سکتے تھے۔ اگر اس کے سوا اس کی کوئی اور حالت ہوتی تو ان کو ہر طرح کے نقصان اور ذلت برداشت کرنے کی ضرورت نہ ہوتی بلکہ قرآن مجید کے دعاوی کو باآسانی باطل کر کے اپنا مقصود حاصل کر لیتے۔

بالجملہ فصحاء عرب کا عاجز رہنا قرآن کے معجزہ ہونے کو بخوبی ثابت کر رہا ہے اور آیات تحدی تین وجہوں سے یہ ثابت کرتی ہیں کہ اسکا معارضہ بشری طاقت سے خارج ہے۔

(پہلی وجہ) قرآن مجید نے فصحائے عرب کے سامنے اپنے معجزہ ہونیکا دعویٰ کیا اور کم سے کم ایک ہی سورہ اس کے مثل پیش کر دینے کا مطالبہ کیا۔ اور پھر کھلم کھلا "فان لم تفعلوا ولن تفعلوا" کہکر انکی عاجزی ظاہر کی کہ وہ اس کے ایک سورہ کا مثل بھی نہیں پیش کر سکتے۔ اور یہ تواتر ثابت ہے کہ اسکے دعاوی بالکل صحیح نکلے۔ یعنی اس کے کسی چھوٹے سے چھوٹے سورہ کا مثل بھی پیش کر دینا ممکن نہ ہوا

حالانکہ کتب تواریخ سے بتواتر یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ کفار حد درجہ دشمنی رکھتے تھے۔ اور آپ کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو مٹا دینے میں اپنی کوشش کا کوئی دقیقہ چھوڑ نہیں رکھا تھا۔ یہانتک کہ حرب و قتال، قتل و اسیری کے تمام مصائب و خطرات کو جھیلنے پر کمربستہ ہوگئے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کا معارضہ کرنا ان کے امکان سے باہر تھا۔ ورنہ اس سے باز نہ رہتے۔ کیونکہ فطرت انسانی کیخلاف ہونے کے سبب اس کی کوئی مثال عالم میں نہیں مل سکتی۔ کہ کوئی شخص اپنے مقصود کے حاصل کرنے کیلئے پرامن اور آسان طریقہ چھوڑ کر خواہ مخواہ جان و مال عزت و آبرو کے تلف کر دینے پر تیار ہو جاتا ہو۔"

(دوسری وجہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی نبوت کی صحت پر کامل یقین تھا۔ اور پورے وثوق کے ساتھ جانتے تھے کہ قرآن کا معارضہ کرنا کسی کے اختیار میں نہیں۔ ہٰذا ان کی خبر اور تحدی درست ثابت ہو کر رہے گی۔ ورنہ ایسے لمبے چوڑے دعادی کرنے اور اتنی صاف و صریح خبریں سنانے کی آپ کو جرأت ہی نہ ہوتی۔ کیونکہ جس جس کو اپنے دعوے کے باطل اور اپنی خبر کے کاذب ٹھہرنے کا معمولی خوف و احتمال بھی ہوگا۔ وہ کبھی اس کے بیان کی جرأت نہیں کر سکتا۔ خصوصاً اس وقت جبکہ اپنے کسی ایسے اہم مقصد کے پورا کرنے کیلئے وہ دعویٰ اور خبریں پیش کر رہا ہو۔ جس کا حاصل ہونا صرف اسی صورت میں ممکن ہو کہ ان دعادی و اخبار کا حق و صادق ہونا ثابت ہو جائے۔

(تیسری وجہ) آنحضرت کی دی ہوئی یہ خبر کہ فصحاء عرب بلکہ تمام جن و انس قرآن کا مثل نہیں لا سکتے بالکل سچی ظاہر ہوئی۔ کیونکہ نہ آپ کے عہد میں منکرین قرآن باوجود پوری کوشش کے اسکا مثل نہیں لا سکتے اور نہ آپ کے بعد اس وقت تک کسی سے ممکن ہوا۔ پس اعجاز قرآن کے ثابت ہونے کیلئے اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا
وَلَهُمْ فِيْهَا اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ٥

اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے انکو (اے پیغمبر!) خوشخبری دیدو کہ ان کے لئے (بہشت کے) وہ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ اور جب انھیں ان (باغات) کا کوئی میوہ کھانے کو ملے گا تو کہیں گے یہ تو وہی (میوہ) ہے جو پہلے بھی ہمیں کھانے کو مل چکا ہے (کیونکہ) انھیں ملتی جلتی صورت و رنگ کے (میوے) ملا کریں گے۔ اور بہشت میں ان کے لئے صاف ستھری بیویاں

ہوں گی اور یہ لوگ اس (باغ) میں ہمیشہ رہیں گے۔"

جو سلسلہ آیتوں کا یہاں تک پہونچا ہے اس میں خاص ترتیب و نظم کا لحاظ کیا گیا ہے یعنی پہلے وجود و وحدت پروردگار عالم کا ذکر دلائل قویہ کیساتھ کیا گیا کیونکہ اصولِ دین میں یہ سب سے مقدم اصل تھی۔ اور اسکے بعد نبوت خاتم النبیین مذکور ہوئی اور اسکی صحت پر دلیل اعجاز قرآن سے استدلال کیا گیا۔ پھر آخر میں معاد و عقاب و ثواب کا تذکرہ شروع کیا گیا۔ جو بروز قیامت کافر و مومن کو دیا جائیگا اگرچہ تمام شرائع الٰہیہ اس پر متفق ہیں کہ خداوند عالم ایک دن بندوں کو انھیں کے اجسام و قوالب کے ساتھ زندہ کریگا۔ جو وہ دنیاوی زندگی میں رکھتے تھے۔ اور انکو ہر نیک و بد عمل کی مناسب جزا دیگا لیکن اسکی مفصل کیفیت مع دلائل و براہین جسطرح قرآن مجید میں مذکور ہے۔ اس کی نظیر دوسری کتابوں میں جن کے الہامی اور منزل من اللہ ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے نہیں مل سکتی۔

معادِ جسمانی کی مکمل استدلالی بحث ہم آئندہ کسی موقع پر لکھیں گے۔ یہاں فقط اتنا بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ کہ ثواب و عقاب، جنت و نار کے متعلق توریت و انجیل کی شہادت کیا ہے اور قرآن مجید نے ہم کو اس کے حالات کیا بتائے ہیں۔ اور ہمارا یہ بیان بھی محض نمونے پیش کر دینے تک محدود رہیگا۔ کیونکہ زیادہ تطویل کی ضرورت نہیں۔"

قرآنی جنت و جہنم

قرآنی جنت و جہنم:۔ قرآن مجید نے جنت و جہنم کی حقیقت کو جن لفظوں میں پیش کیا ہے ان میں چند آیتیں اور انکا خلاصہ مفہوم یہاں پر درج کیا جاتا ہے۔ (تفصیلی معانی اپنے اپنے مقام پر درج ہوں گے)

(آیاتِ جنت) وَعَدَ اللّٰہُ المومنین والمومنٰت جناتٍ تجری من تحتھا الانھٰر خالدین فیھا و مساکن طیبۃ فی جنات عدن و رضوانٌ من اللّٰہ اکبر ذالک ھو الفوز العظیم۔

"ارباب ایمان سے اللہ نے ان جنتوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے ان کے سدا بہار باغات میں پاکیزہ رہائش گاہیں ہیں، اور اللہ کی خوشنودی تو سب سے بالاتر ہے۔ بس یہی بڑی کامیابی ہے ــــــــــــ"

(۲) ان الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات یھدیھم ربھم بایمانھم تجری من تحتھم الانھار فی جنات النعیم ط دعواھم فیھا سبحانک اللّٰھمّ وتحیتھم فیھا سلام و اٰخر دعواھم ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین

"نیکو کار مومنین کو ان کے ایمان کی بدولت ان نعمات کی جنتوں میں پہونچا دے جنکے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ اس مقام میں ان لوگوں کا بس یہ قول ہوگا کہ اے خدا تو پاک و پاکیزہ ہے۔ ان کی باہمی خیر و صلاح سلام سے ہوگی، اور آخری صدا الحمد للّٰہ رب العالمین ہوگا ــــــــــ"

(۳) وسیق الذین اتقوا الی الجنۃ زمراً حتیٰ اذا جاءوھا و فتحت ابوابھا و قال لھم خزنتھا سلام علیکم طبتم فادخلوھا خٰلدین۔

"خدا ترس لوگ گروہ گروہ جنت کی طرف بلائے جائینگے یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہونچیں گے اور دروازے کھول دئے جائیں گے۔ تو جنت کے خازن ان سے کہیں گے کہ سلام علیکم (تم پر سلامتی ہو) تم اچھے رہے۔ تم بہشت میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ۔"

(۴) مَن عمل صالحاً من ذکر او انثیٰ وھو مومنٌ فلنحیینّہ حیوۃً طیبۃً۔

"نیکوکار مرد و زن بشرطیکہ ایمان دار ہوں تو ہم انکی اخروی زندگی کو پاکیزہ زندگی قرار دینگے۔"

(۵) والذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت لندخلنّھم فی الصّٰلحین۔

"نیکوکار مومنین کو ہم اپنے صالح بندوں میں شامل کریں گے۔"

(۶) جنات عدن یدخلونھا یحلون فیھا من اساور من ذھب و لؤلؤاً ولباسھم فیھا حریرٌ و قالوا الحمد للّٰہ الذی اَذْھَبَ عنّا الحزن ان ربنا لغفورٌ شکورٌ الذی احلنا دار المقامۃ من فضلہ لا یمسنا فیھا نصبٌ و لا یمسنا فیھا لغوب۔

"سدا بہار جنتیں ہیں جن میں یہ لوگ داخل ہوں گے انھیں وہاں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے۔ اور ان کی پوشاک وہاں خالص ریشمی ہوگی۔ اور یہ لوگ (خوش ہو کر) کہیں گے خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہم سے ہر طرح کا رنج و غم دور کر دیا۔ بیشک ہمارا پروردگار بڑا بخشنے والا (اور) قدردان ہے جس نے ہم کو اپنے فضل و کرم سے ہمیشگی کے گھر (جنت) میں اتارا جہاں نہ ہمیں کوئی خستگی چھو سکے گی۔ اور نہ کوئی تکان پہونچے گا۔"

(۷) الا عباد اللّٰہ المخلصین اولٰئک لھم رزق معلوم فواکہ وھم مکرمون فی جنات النعیم علیٰ سررٍ متقابلین یطاف علیھم بکاسٍ من معین بیضاء لذۃ للشاربین لا فیھا غولٌ ولا ھم عنھا ینزفون و عندھم قاصرات الطرف عین کانھنّ بیضٌ مکنون۔

"مگر خدا کے برگزیدہ بندے ان کے لئے (بہشت میں) ایک مقرر روزی ہوگی اور ہر طرح کے میوے (ہوں گے) اور وہ لوگ بڑی عزت سے نعمتوں کے باغات میں تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ ان میں صاف سفید براق شراب کے جام کا دور چل رہا ہوگا جو پینے والوں کو بڑا مزا دے گی۔ نہ اس شراب میں دردِ سر ہوگا۔ اور نہ وہ اس کے پینے سے آپے سے باہر ہوں گے۔ اور ان کے پاس نیچی نگاہ والی اور بڑی آنکھوں والی (حوریں) ہوں گی۔ اور ان کی صاف رنگت میں ہلکی سرخی اس طرح جھلکتی ہوگی۔ جیسے وہ انڈے جو چھپا کے رکھے ہوں۔"

(۸) انّ المتقین فی جنات و نھرٍ فی مقعد صدقٍ عند ملیکٍ مقتدرٍ۔

"بیشک پرہیزگار لوگ بہشت کے باغوں اور نہروں میں یعنی پسندیدہ مقام میں ہر طرح کی قدرت رکھنے والے

بادشاہ کی بارگاہ میں (مقرب) ہوں گے ——————"

(۹) یا ایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی ۔

اے نفس مطمئن اپنے پروردگار کی طرف پلٹ آ۔ تو اس سے خوش وہ تجھ سے راضی، تو میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

(۱۰) وفیہا ما تشتہیہ الانفس وتلذ الاعین ۔

اس جنت میں وہ تمام چیزیں ہوں گی جن کی روحیں خواہشمند ہوں اور آنکھیں لذت گیر ۔"

(آیاتِ جہنم) اذ تبرأ الذین اتبعوا من الذین اتبعوا ورأوا العذاب وتقطعت بہم الاسباب وقال الذین اتبعوا لو ان لنا کرۃ فنتبرأ منہم کما تبرءوا منا کذلک یریہم اللہ اعمالہم حسرات علیہم وما ہم بخارجین من النار

جب (قیامت کے دن) پیشوا لوگ اپنے پیروؤں سے پیچھا چھڑا لینے کے عذاب ملنے ہو گا کل باہمی روابط کٹ چکے ہوں گے۔ اور پیرو کہنے لگیں گے کہ اگر دنیا میں ہمیں دوبارہ پلٹنا مل جائے تو ہم بھی ان سے اسی طرح الگ ہو جائیں۔ جیسے (آج) یہ لوگ ہم سے الگ ہو گئے۔ یوں ہی خدا ان کے اعمال کو حسرت ویاس کی شکل میں انہیں دکھائے گا۔ اور وہ جہنم سے باہر نہ جا سکیں گے ۔"

(۲) واستفتحوا وخاب کل جبار عنید من ورائہ جہنم ویسقیٰ من ماء صدید یتجرعہ ولا یکاد یسیغہ ویاتیہ الموت من کل مکان وما ہو بمیت ومن ورائہ عذاب غلیظ

اور ان (پیغمبروں) نے اپنی کامیابی کی دعا مانگی (دعا قبول ہوئی) اور ہر ایک عداوت رکھنے والا سرکش ہلاک ہوا (اس دنیوی سزا کے بعد) اس کے پیچھے ہی پیچھے جہنم ہے۔ (جہاں) اسے پیپ لہو بھرا ہوا پانی پلایا جائے گا جسے گھونٹ (زبردستی) پئے گا۔ اور حلق سے بآسانی نہیں اتار سکے گا اسے ہر طرف موت آتی دکھائی دیگی حالانکہ وہ مرے گا نہیں اور اسکے پیچھے سخت عذاب ہو گا ۔"

(۳) ہذان خصمان اختصموا فی ربہم فالذین کفروا قطعت لہم ثیاب من نار یصب من فوق رءوسہم الحمیم یصہر بہ ما فی بطونہم والجلود ولہم مقامع من حدید کلما ارادوا ان یخرجوا منہا من غم اعیدوا فیہا وذوقوا عذاب الحریق ۔

یہ دونوں (مومن کافر) دو فریق ہیں۔ آپس میں اپنے پروردگار کے بارے میں لڑتے ہیں۔ تو جو لوگ کافر ہو بیٹھے ان کے لئے آگ کے کپڑے قطع کئے گئے ہیں (جو ان کو پہنائے جائینگے اور) ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی انڈیلا جائے گا جس سے ان کے پیٹ کی آنتیں اور کھالیں سب گل جائیں گی۔ اور ان کے مارنے کے لئے لوہے کے گرز ہوں گے کہ جب صدمہ کے مارے چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل بھاگیں تو انکو اندر ڈھکیل دئے جائینگے (اور ان سے کہا جائے گا) کہ جلانے والے عذاب کے مزے چکھو۔

(۴) واذ یتحاجون فی النار فیقول الضعفاء للذین استکبروا انا کنا لکم تبعا فہل انتم مغنون عنا نصیبا من النار قال الذین استکبروا انا کل فیہا ان اللہ قد حکم بین العباد وقال الذین فی النار لخزنۃ جہنم ادعوا ربکم یخفف عنا یوما من العذاب قالوا اولم تک تاتیکم رسلکم بالبینات قالوا بلیٰ قالوا فادعوا وما دعاء الکفرین الا فی ضلل ۔

اور جس وقت یہ لوگ جہنم میں باہم جھگڑیں گے تو کم حیثیت لوگ بڑے آدمیوں سے کہیں گے کہ ہم تمہارے تابع تھے تو کیا تم اس وقت آگ کا کچھ حصہ ہم سے ہٹا سکتے ہو۔ تو بڑے لوگ کہیں گے اب تو ہم سب کے سب آگ میں پڑے ہیں۔ خدا کے بندوں کے بارے میں فیصلہ کر چکا جو لوگ آگ میں جل رہے ہیں گے وہ جہنم کے داروغہ سے کہیں گے کہ تم اپنے پروردگار سے عرض کرو کہ کسی ایک دن تو وہ ہمارے عذاب میں تخفیف کر دے وہ جواب دینگے کیا تمہارے پاس تمہارے پیغمبر صاف اور روشن معجزے لیکر نہیں آئے تھے۔ وہ کہیں گے ہاں! (آئے تو تھے) تو وہ فرشتے کہیں گے کہ تم خود ہی اس سے دعا کرو۔ حالانکہ کافروں کی دعا بیکار ہی ہے۔"

(۵) ذلک الیوم الحق فمن شاء اتخذ الی ربہ مابا۔ انا انذرناکم عذابا قریبا یوم ینظر المرء ما قدمت یداہ ویقول الکافر یالیتنی کنت ترابا

وہ دن برحق ہے تو جو شخص چاہے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں اپنا ٹھکانا بنائے۔ ہم نے تم لوگوں کو عنقریب آنیوالے عذاب سے ڈرایا۔ جس دن آدمی اپنے ہاتھوں پہلے سے بھیجے ہوئے (اعمال) کو دیکھے گا اور کافر کہے گا اے کاش میں خاک ہوتا ——————"

(۶) کلا انہم عن ربہم یومئذ لمحجوبون ثم انہم لصالوا الجحیم ۔

بیشک یہ لوگ اپنے پروردگار (کی رحمت) سے اس دن روک دئے جائینگے پھر یہ لوگ ضرور جہنم داخل ہوں گے۔

(۷) ولا یکلمہم اللہ ولا ینظر الیہم یوم القیامۃ ولا یزکیہم ولہم عذاب الیم ۔

قیامت کے دن نہ خدا ان سے بات کریگا نہ ان کی طرف نظرِ رحمت ڈالے گا اور نہ انکو (گندگی) سے پاک کرے گا ان کے لئے دردناک عذاب ہے ——————"

(۸) ان ذلک لحق تخاصم اہل النار

اس میں شک نہیں جہنمیوں کا باہم جھگڑنا (جسکی تفصیل اس آیت کے قبل ہے) یہ بالکل ٹھیک یقینی ہے ——————

ان تمام آیات کو بغور دیکھنے سے مندرجہ امور معلوم ہو سکتے ہیں:۔

(۱) اہلِ جنت کو سب سے بڑی نعمت جو حاصل ہو گی وہ خدائے تعالیٰ کی رضامندی ہے۔

(۲) جنت والوں کی زندگی نہایت پاک زندگی ہو گی۔ اور مخصوص صالح بندوں کی صف میں جگہ پائینگے لہٰذا ان کے کسی فعل کو فسق وفجور سے نسبت دینا بہت بڑی غلطی ہے۔

(۳) ان کی معرفت کا درجہ اتنا بلند ہوگا کہ جنت کی تمام نعمات بھی ان کو تسبیح وتحمید سے غافل نہ کرسکیگی
(۴) انکے مراتب اتنے عالی ہوں گے کہ فرشتے بھی انکو سلام کرینگے اور ابدی امن وراحت کی خوشخبری سنائیں گے۔

(۵) جنت مقام قدس ہے اور وہاں کے رہنے والوں کو پروردگار عالم سے قرب منزلت حاصل ہوگا جس سے بڑھکر روحانی لذت اور کسی نعمت سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ اور جو اسباب عیش ولذت جسمانی وہاں مہیا ہوں گے۔ وہ پروردگار عالم کی شان قدس کے خلاف نہ ہوں گے۔ اور نہ ان سے اہل جنت کی روحانیت میں خلل واقع ہوگا۔

(۶) اہل جہنم کو جسمانی آلام کے ساتھ ساتھ بلکہ ان سے پہلے روحانی آلام کا سامنا ہوگا۔ اس لئے کہ ان کے وہ وسائل قطع ہو جائیں گے جن پر وہ دنیا میں بھروسہ کئے بیٹھے تھے۔ اور ان کا ہر عمل سراسر حسرت بنکر ان کے سامنے نمودار ہوگا۔ جس سے اندوہناک ہوکر کہیں گے کہ کاش وہ خاک ہو گئے ہوتے
(۷) قرب خدا سے محجوبی اور اسکی نظر رحمت سے محرومی اہل جہنم کا خاص روحانی عذاب ہے وغیرہ وغیرہ

نصاریٰ کا اعتراض

ان حقائق کے واضح ہو جانے کے بعد ہم قارئین کرام کو مخالفین اسلام خصوصاً مسیحیوں کے ایک اعتراض کیطرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں جو انکی کتابوں میں بڑی شد ومد کے ساتھ درج کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے۔

"قرآن واحادیث کے مطابق مسلمانوں کی مبارک بادی آخرت میں ان باتوں میں ہوگی کہ لباس فاخرہ پہنیں گے۔ بڑی بڑی شاندار پلنگوں پر تکیہ لگا کر بیٹھیں گے۔ نہایت نفیس اور خوش مزہ پھل کھاویں گے۔ غایت درجہ کی عمدہ شراب نوش کریں گے۔ جس سے سرور نہیں ہوگا۔ اور حوروں کی ازواج کے ساتھ بے تکلفی سے عیش کریں گے ایسا بہشت جسمانی ہے اور اس میں وہ چیزیں مہیا کی گئی ہیں جن سے آدمی کی جسمانی خواہشیں پوری ہوتی ہیں۔ لیکن اس میں مقدس وپاک باطن مرد وزن کے لئے بالکل جگہ نہیں ہے۔ پاک دل لوگ ایسی بہشت سے کوسوں دور بھاگیں گے جیسے کہ وہ اس دنیا میں شکم پرستی وے خواری اور فسق وفجور سے دور بھاگتے ہیں۔ اس قسم کا بہشت خدا تعالیٰ کا مہیا کردہ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہ ذات باری تعالیٰ قدوس ہے۔ اس کی ذات پاک گناہ اور ہر طرح کی ناپاکی کی مخالف ہے۔ روح انسانی جو عرفان وعبادت الٰہی کے لئے پیدا کی گئی ہے جس کو ہمیشہ اپنے خالق کی محبت وقربت میں روحانی راحت تلاش کرنی چاہیئے۔ ایسی جسمانی لذات سے کب راحت واطمینان پا سکتی ہے اس میں بھی عیاش لوگ آخرکار اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ جسمانی لذات کا آخر خوشی نہیں بلکہ کراہیت ہے۔

لہٰذا بہشت کے قرآنی بیان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن من جانب اللہ ہے۔"
(میزان الحق مصنفہ پادری سی، جی فانڈر صاحب ص ۳۲۸)

تفصیلی جواب

چونکہ اس فریب دہ اعتراض سے جہلا کو اکثر بہکانے کی کوشش کی جاتی ہے اس لئے ہم اس کے ایک ایک جملہ کی تنقید کرکے پوری حقیقت واضح کرتے ہیں۔

قولہ - قرآن واحادیث کے مطابق مسلمانوں کی مبارکبادی آخرت میں ان باتوں میں ہوگی کہ لباس فاخرہ پہنیں گے۔ الخ

اقول - یہ کہنا محض نادانی اور صریح کذب ہے کیونکہ آیات قرآنی محض جسمانی لذتوں کی خبر نہیں سناتے بلکہ روحانی لذات کا تذکرہ بھی نہایت واضح طور سے کر رہے ہیں۔ کیا کوئی امر ایسا بھی متصور ہوسکتا ہے جو قرب ورضائے الٰہی سے بھی بڑھ کر روحانی لذت وسرور کا باعث ہو؟ اگر خیال میں آسکتا ہو تو اس کو بتانا چاہیئے۔

قولہ - ایسا بہشت جسمانی ہے اور اسمیں وہ چیزیں مہیا کی گئی ہیں جن سے آدمی کی جسمانی خواہشیں پوری ہوتی ہیں۔

اقول - وہ بہشت محض جسمانی نہیں بلکہ روحانی بھی ہے اور اسمیں وہ اسباب بھی مہیا کر دیئے گئے ہیں جن سے زیادہ روحانی لذت وسرور کا آدمی تصور نہیں کرسکتا۔ خواہش کرنا تو درکنار۔ مثلاً قرب ورضائے الٰہی اس کے آثار عظمت وکرامت کا نظارہ۔ صلحا واولیاء اللہ کی رفاقت، اور یہی وہ امور ہیں جن پر روحانی خواہشوں کی انتہا ہو جاتی ہے اور جن سے محروم رہ جانے پر روحانیین صبر نہیں کرسکتے۔ جیسا کہ معلم روحانیت امیر المومنین علیہ السلام کی دعاؤں کے ان چند فقروں سے واضح ہوتا ہے۔

(۱) فلئن صیرتنی فی العقوبات مع اعدائک وجمعت بینی وبین اہل بلائک وفرقت بینی وبین احبائک واولیائک فہبنی یا الٰہی وسیدی ومولائی وربی صبرت علی عذابک فکیف اصبر علی فراقک وہبنی صبرت علی حر نارک فکیف اصبر عن النظر الی کرامتک۔

(اے معبود) اگر تو مجھے اپنے دشمنوں کے ساتھ عذاب کی سختیوں میں ڈالے گا اور مجھے اہل بلا کے ساتھ اکٹھا کرے گا اور اپنے مخصوص اولیاء اور دوستوں سے مجھے الگ کر دے گا تو اے میرے معبود، اے میرے سردار، اے میرے آقا! اگر میں تیرے عذاب پر بالفرض صبر بھی کروں تو تیرے فراق پر کیوں کر صبر کروں گا۔ اور میں تیری حرارت آتش جہنم کو برداشت بھی کروں۔ تو تیری کرامت پر نظر کی محرومی کو کیسے برداشت کرسکوں گا۔"

(۲) فقد انقطعت الیک ھمتی وانصرفت نحوک
رغبتی فانت لا غیرک مرادی ولک لا لسواک
سھری وسھادی ولقاءک قرۃ عینی ووصلک
منی نفسی والیک شوقی وفی محبتک ولھی والی
ھواک صبابتی ورضاک بغیتی ورؤیتک حاجتی
وجوارک طلبی وقربک غایۃ سؤالی۔

(اے مالک) میرا ارادہ بس تیری طرف منقطع ہو چکا ہے اور میری خواہش صرف تیری طرف متوجہ ہے۔ بس تیرے سوا کوئی میرا مقصود نہیں۔ اور بجز تیرے اور کسی کے لئے میری اختر شماری اور بیداری نہیں ہے۔ تیری لقا میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اور تجھ سے وصال میری روح کی آرزو ہے۔ میرا شوق تیری طرف (رواں) ہے۔ میری سرگشتگی تیری محبت میں (گم) ہے۔ میرے دل کی سوزش تیرا عشق ہے۔ اور مطمح نظر تیری رضا جوئی ہے۔ میری حاجت تیری زیارت اور میرا مطلب تیری ہمسائیگی، اور میرے سوال کی غرض (اور حد آخر) تیرا قرب ہے۔"

قولہ:۔ لیکن اس میں مقدس و پاک باطن مرد و زن کیلئے بالکل جگہ نہیں ہے۔ پاک دل لوگ ایسے بہشت سے کوسوں دور بھاگیں گے۔ جیسے کہ وہ اس دنیا میں شکم پرستی و میخواری اور فسق و فجور سے دور بھاگتے ہیں۔"

اقول:۔ قرآن جس بہشت کی خبر دیتا ہے اس میں ساری جگہیں صرف انھیں لوگوں کے لئے ہیں جو مقدس و پاک باطن ہوں گے۔ وہاں انکو مقام قدس میں قرب و رضائے الٰہی کی لذت روحانی حاصل ہوگی۔ اور ان کی آنکھوں کو آثار رحمت و کرامت الٰہی کا نظارہ نصیب ہوگا۔ پس آخر وہ کون سے پاک دل لوگ ہوں گے جو ان نعمات روحانی سے بھاگیں گے۔ اور بھاگ کر آخر کس جانب کو رخ کریں گے؟ جو لوگ قرب و رضائے الٰہی سے بھاگنے والے ہوں ان کو مقدس و پاک باطن کہنا ہی نادانی ہے۔ اگر خدا کی دی ہوئی نعمتوں سے حظ اٹھانا مطلقاً فسق و فجور ٹھہرایا جائے تو دنیا میں کوئی فرد انسانی ایسی نہ ملیگی جسکو فاسق و فاجر کے سوا مقدس و پاک باطن کہا جائے۔ خواہ وہ انبیاء و رسل ہی کیوں نہ ہوں۔ پھر وہ جنت سے بھاگنے والے آخر کون لوگ ہوں گے۔؟ پادری صاحب کو لازم تھا کہ اعتراض کرنے کے پہلے فسق و فجور اور تقویٰ و تقدس کے معانی سمجھ لیتے۔

قولہ:۔ اس قسم کا بہشت خدائے تعالیٰ کا مہیا کردہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ ذات باری تعالیٰ قدوس ہے اور اسکی ذات پاک گناہ اور ہر طرح کی ناپاکی کے مخالف ہے۔

اقول:۔ وہ کونسی نعمت بہشت کی قرآن و احادیث میں بتائی گئی ہے جسکے نمونے دنیا میں خدا نے پیدا نہیں کئے ہیں۔ اگر شراب نہیں تو اس کے مواد ہی سہی مگر کوئی شئے خلق کرنے سے چھوڑی نہیں ہے (اور یہ کلام محض اس بنا پر ہے کہ آیا پادری صاحب جنتی شراب کو بھی ویسی ہی سمجھتے ہیں جیسی دنیا میں بنائی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ فرض خود بیان قرآنی کے خلاف اور محض اتہام ہے)۔ پس اگر ان نعمات کا بہشت میں پیدا کرنا خالق کی شانِ قدس کے خلاف نظر آتا ہے تو پہلے دنیاوی نعمات و لذات جسمانی ہی کے خلق کرنے کے سبب اس کی ذات کے مقدس اور پاک ہونے کا اعتقاد دل سے نکال پھینکنا لازم ہے بلکہ یہاں ایسا سمجھنا زیادہ لازم ہے اس لئے کہ انھیں دنیاوی نعمات و لذات کے پیچھے ایک عالم تقدس اور پاکیزگی کو چھوڑ کر گناہ و ناپاکی میں مبتلا ہے اور اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ اس نے اپنی شانِ قدس کے خلاف ہی عمل کرنے پر اکتفا نہ کی بلکہ اپنے ساتھ بندوں کو بھی گناہ گار و ناپاک بنا دیا (نعوذ باللہ من ذالک)

اور نہ معلوم اس کلام "اس کی ذات پاک گناہ اور ہر طرح کی ناپاکی کے مخالف ہے" کا مطلب کیا ہے اگر یہ ہے کہ جسمانی لذات و نعمات کا پیدا کرنا ہی گناہ و ناپاکی ہے؟ تو دنیا میں پیدا کرنے کے سبب سے مخالف نہیں بلکہ سراسر موافق اور ناپاکی و گناہ کی مرتکب ٹھہرتی ہے۔ اور اگر یہ مقصود ہے کہ ان سے منتفع ہونا گناہ و ناپاکی ہے خواہ وہ خداوند عالم کے بتائے ہوئے احکام و قوانین کے مطابق ہی کیوں نہ ہو؟ تو ایسا ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ اپنے معین کئے ہوئے حدود و قوانین کے اندر حظ اٹھانے کی پوری موافقت کرتا ہے اور عوام ناس تو کیا انبیاء و رسل بھی ان سے منتفع ہوتے رہتے ہیں۔ پھر کیا وہ سبکے سب فسق و فجور میں مبتلا تھے؟ اور اگر یہ مراد ہے کہ ان نعمتوں کو خالق کے مقررہ حدود و قوانین کے خلاف کام میں لانا گناہ اور ناپاکی ہے۔؟ تو یہ بے شک صحیح ہے۔ مگر اس اعتراض میں یہ بھی بتانا چاہیئے تھا کہ اہل جنت ایسا ہی کرینگے۔ اور باوجود اس کے قرآن و احادیث میں انکو مقدس و طاہر بتایا گیا ہے

قولہ۔ اس جہاں میں بھی عیاش لوگ آخرکار اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ جسمانی لذات کا آخر خوشی نہیں بلکہ کراہیت ہے۔

اقول:۔ ہاں بعض لوگ اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں مگر اس لئے نہیں کہ دنیاوی عیش بہر صورت گناہ و ناپاکی ہے بلکہ اس لئے کہ اسکا آخر فنا ہے اور اس میں زیادہ غرق رہنا خداوند عالم کی یاد سے غافل اور اسکی عبادت میں سست و کاہل بنا دیتا ہے۔ پھر جبکہ جنت کے عیش میں ان دونوں خرابیوں میں سے کوئی بھی موجود نہیں ہوگی تو اسکی بابت کوئی شخص نتیجہ مذکورہ پر کیونکر پہونچ سکتا ہے؟

قولہ:۔ لہٰذا بہشت کے قرآنی بیان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن منجانب اللہ ہے۔

اقول:۔ قرآن کا منجانب اللہ ہونا اس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ وہ روحانی و جسمانی دونوں طرح کی لذات کی خوشخبری سناتا ہے۔ اور وہ اس بارے میں ان تمام کتب سابقہ سے کامل اتفاق رکھتا

ہے جو خدا کیطرف سے نازل کی گئی تھیں۔ اور جن وجوہ سے رائج انجیلوں کا منجانب اللہ نہ ہونا ثابت ہوتا ہے ان میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ معاد جسمانی کا انکار کرتی ہیں اور اس بارے میں انکا بیان توراۃ کے بالکل خلاف ہے۔ حالانکہ انھیں میں جناب عیسیٰ کا یہ ارشاد بھی درج ہے۔ "یہ نہ سمجھو کہ میں توراۃ یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ توراۃ سے ہرگز نہ ٹلے گا۔ جب تک سب کچھ پورا نہ ہو جائے (متی ۵ - ١٧ - ١٨)

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِيٓ أَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
فَيَعْلَمُوْنَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَأَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ أَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا
يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ إِلَّا الْفَاسِقِيْنَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ
اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ أَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ أَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْأَرْضِ ۚ
أُولٰٓئِكَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَ ۝

(ترجمہ) بیشک خدا مچھر یا اس سے بھی بڑھکر حقیر چیز کی کوئی مثل بیان کرنے میں نہیں جھینپتا پس جو لوگ ایمان لاچکے ہیں وہ تو یقین جانتے ہیں کہ یہ مثل بالکل ٹھیک ہے اور انکے پروردگار کی طرف سے ہے لیکن جو لوگ کافر ہیں وہ بول اٹھتے ہیں کہ خدا کا اس مثل سے کیا مطلب ہے۔ ایسی مثل سے خدا بہتیروں کو گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور ایسی مثل سے بہتیروں کی ہدایت کر دیتا ہے۔ مگر گمراہی میں چھوڑتا بھی ہے۔ تو ایسے بدکاروں کو جو خدا کے عہد و پیمان کو مضبوط ہو جانے کے بعد توڑ ڈالتے ہیں۔ اور جن تعلقات کا خدا نے حکم دیا ہے انکو قطع کر دیتے ہیں اور ملک میں فساد کرتے پھرتے ہیں یہی لوگ گھاٹا اٹھانے والے ہیں۔

(١) خداوند عالم نے جبکہ بتوں اور انکی عبادت کے بارے میں مثل مکھی اور مکڑی کی بیان کی تو یہود نے اس پر یہ طعن کیا کہ ایسی حقیر چیزوں کی مثل بیان کرنا خدا کی شان کے لائق نہیں ہے۔ پس اس طعن کو رد کرنے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی اور محصل اسکے جواب کا یہ ہے کہ حقیر مخلوقات بھی بڑی چیزوں کی طرح اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ اور اس لئے باعتبار مرتبہ و منزلت کے اس کے نزدیک دونوں برابر ہیں پھر ان کی مثل بیان کرنے میں اسکو شرم کیوں آنے لگی۔ رہا یہ فرق کہ ایک مخلوق کمزور اور دوسری طاقتور ہے تو اس سے وہ خدا کے نزدیک مرتبہ میں حقیر یا عظیم نہیں ہو سکتی۔

ضرب المثل کی حکمت چونکہ مثالوں کے ذریعہ سے اصل مضمون ذہن انسانی سے قریب تر ہوتا جاتا ہے اور بسہولت سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس لئے ارباب عقل اکثر مثالوں کو پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور مثال میں حقیر و عظیم

کا اعتبار کبھی نہیں کیا جاتا۔ بلکہ صرف اصل غرض و مضمون کو ذہن سامع سے قریب تر کر دینے کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس مقام پر خدا نے مچھر کو مثالاً پیش فرمایا ہے اس میں اسکی حکمت و صنعت کا وہ اعلیٰ کمال موجود ہے جو عظیم الجثہ ہاتھی میں نہیں ہے۔ حدیث معصوم میں ہے کہ باوجود صغیر الجسم (حقیر جسم) ہونے کے مچھر کو مقام مثال میں خدا نے صرف اس لئے ذکر کیا ہے کہ ہاتھی کے باوجود عظیم الجثہ ہونے کے جتنے اعضا اس نے بنائے ہیں وہ سب اعضا مچھر کو بھی دیئے ہیں بلکہ دو عضو (دو پر) اسکو زیادہ عطا کئے ہیں۔ چنانچہ خدا نے اس مثال کو پیش کر کے مومنین کو اپنی صنعت عجیب اور خلقت لطیف کی طرف خاص طور پر متوجہ فرمایا ہے (مجمع البیان)

(٢) **حیا** اس کیفیت اور تغیر کو کہتے ہیں جو انسان کے نفس و بدن میں اس خوف سے پیدا ہو جاتا ہے کہ دوسرے لوگ اس پر عیب لگائیں گے اور مذمت کریں گے۔ پس "حیا" کی نسبت حقیقی معنی میں خداوند عالم کی طرف درست نہ ہوگی۔ کیونکہ وہ روح و بدن دونوں سے منزہ ہے۔ لہذا یہاں اس لفظ کا استعمال باعتبار مجاز کے دوسرے معانی میں سمجھنا چاہیئے۔ اور وہ یہ کہ حیا ہو یا دیگر کیفیات جو نفس و جسم کو عارض ہوتے ہیں۔ ان سب کے لئے ایک ابتدا اور ایک انتہا ہوتی ہے۔ پس وہ اپنی ابتدا کے اعتبار سے نہیں بلکہ انتہا کے لحاظ سے خداوند عالم کی طرف منسوب کیجا سکتی ہیں۔ مثلاً "حیا" کی ابتدا یہ ہوتی ہے کہ کسی امر قبیح پر ملامت و مذمت کے خوف سے ایک خاص تغیر انسان کے نفس و جسم میں لاحق ہو جاتا ہے اور اسکی انتہا یہ ہوتی ہے کہ وہ اس قبیح و مذموم امر کو ترک کر دیتا ہے اسی طرح غضب کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ وہ دل کا خون جوش میں آتا ہے اور قوت انتقام حرکت میں آجاتی ہے جس سے نفس و جسم میں ایک خاص کیفیت عارض ہو جاتی ہے۔ اور اسکی انتہا یہ ہوتی ہے کہ جس کا فعل باعث ناراضی ہوا ہوتا ہے اس پر عذاب و عقاب کرنے لگتا ہے۔ پس "حیا و غضب" کو ابتدائی حالت کے اعتبار سے خداوند عالم کی طرف منسوب کرنا درست نہیں ہو سکتا۔ مگر انکی انتہا یعنی ترک قبیح اور فعل عذاب و عقاب کے لحاظ سے اسکی جانب منسوب کئے جاسکتے ہیں۔

(٣) ہم نے اس سے پہلے متعدد دلیلوں سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بندہ اپنے افعال کا فاعل مختار ہے۔ تمام بُرے یا بھلے کاموں کو اپنے ارادہ و اختیار سے کرتا ہے۔ خداوند عالم کے ارادہ و اختیار کو اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ لہذا ان دلائل پر نظر کرتے ہوئے ہر شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ یضل بہ کثیرا کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ خدائے تعالیٰ ابتداءً بندوں میں کفر و ضلالت کو خلق کرتا ہے اور وہ اسی کے ارادہ و فعل سے مجبور ہو کر کافر و گمراہ ہو جاتے ہیں۔ بلکہ اسکی صحیح تاویل کچھ اور ہوگی۔ مگر بوجہ مناسبت مقام مزید توضیح کیلئے ہم دوسری چند

دلیلوں سے یہاں بھی یہ ثابت کر دینا چاہتے ہیں کہ اضلال اس معنیٰ سے جو اہلِ جبر نے اختیار کیا ہے خدا کا فعل نہیں ہو سکتا۔

(پہلی دلیل) امام فخرالدین رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ "اضلال" کے معنی لغت میں یہ ہیں "الدعاء الی ترک الدین وتقبیحہ فی عینہ" یعنی دین کو چھوڑ دینے کیطرف بلانا اور اسکو انسان کی نگاہ میں بدنما کر دینا۔" اور خداوند عالم نے اسی معنی سے "اضلال" کو ابلیس اور فرعون کی طرف ان آیات میں نسبت دی ہے۔

(۱) اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ بیشک وہ (شیطان) کھلا ہوا گمراہ کن ہے۔

(۲) فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ۔ شیطان نے انکے افعال کو ان کے لئے خوشنما بنا دیا اور انھیں راہِ (حق) سے روک دیا۔

(۳) قَالَ الشَّيْطٰنُ شیطان نے کہا کہ (کفر اختیار کر)

(۴) وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کر دیا اور رہنمائی نہیں کی۔

(۵) وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ اور سامری نے ان لوگوں کو گمراہ بنا دیا۔

پھر اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "اس امر پر امت کا اجماع ہے کہ خداوند عالم کی طرف سے اس معنیٰ سے اضلال کو منسوب کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ اس نے کسی کو کفر کیطرف نہیں بلایا اور نہ رغبت دلائی ہے بلکہ زجر و توبیخ کے ساتھ اس سے نہی کی ہے اور عقاب کا خوف دلایا ہے۔"

پس جبکہ گمراہی کیطرف بلانا فقط شیاطین جن و انس کا کام ہے۔ اور باجماعِ امت یہ ثابت ہو چکا ہے کہ خداوند عالم کے لئے جائز نہیں کہ کسی کو گمراہی کی طرح دعوت دے تو آخر یہ کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ بندوں میں اسکو خلق فرمائے اور بجبر ان کو ایمان لانے سے روک دے۔ ہر عاقل یہ سمجھ سکتا ہے کہ ضلالت کو خلق کر کے بندوں کو ایمان قبول کرنے سے مانع ہونا ضلالت کی طرف بلانے اور اسکو نگاہوں میں خوشنما بنا دینے سے بدتر فعل ہے۔ کیونکہ محض بہکانے اور ضلالت کی راہ دکھانے سے بندہ کا بے اختیار اور خواہ مخواہ گمراہ ہو جانا لازم نہیں آتا۔ اسی لئے تو شیطان اپنے تابعین سے یہ کہے گا۔ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ (تم پر میری حکومت تو تھی نہیں ہاں میں نے تمکو دعوت (گمراہی) دی۔ تم نے قبول کر لیا۔ تو اب تم لوگ میری ملامت نہ کرو (بلکہ) خود اپنی ملامت کرو۔)

برخلاف اس کے خلق ضلالت کے بعد ایمان کا اختیار و امکان باقی ہی نہیں رہتا۔ پس جب پہلا

خدا کے لئے قبیح اور اس کے امر و نہی و وعید کے خلاف سمجھا جاتا ہے تو دوسرے امر کو بدرجہ اولیٰ ایسا ہی سمجھنا چاہیئے۔ ورنہ "الفرار من المطر والقرار تحت المیزاب" (بارش سے بھاگ کر پرنالے کے نیچے رک جانا) مصداق بننا پڑے گا۔

(دوسری دلیل) اگر ضلالت کی دعوت دینا شیطان کا کام اور خلق ضلالت خدا کا فعل ہوتا تو شیطان اپنے تابعین سے "اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ" نہ کہتا بلکہ یہ کہتا کہ میں نے تم کو فقط دعوت ہی دی تھی گمراہ تو خدا نے بنا دیا۔ لہٰذا مجھے ملامت کرنے کے بجائے اپنے رب کی ملامت کرو۔ نیز چونکہ شیطان بھی خدا ہی کا ایک بندہ ہے لہٰذا اسکی دعوت ضلالت اور بروز قیامت تابعین سے اس کی یہ ساری گفتگو خدا ہی کی خلق کی ہوئی ہو گی۔ لہٰذا یہ کہنا پڑے گا کہ خدا خود ہی بندوں کو بہکاتا اور گمراہ بناتا ہے اور پھر اپنی برأت ظاہر کرنے کیلئے شیطان اور اسکی پیروی کرنے والوں سے ایک دوسرے کی ملامت کرائیگا بالجملہ اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ "اضلال" خدا کا فعل ہے تو طبق در طبق قباحتوں کو خدائی فعل ماننا پڑیگا۔

(تیسری دلیل) جن جن آیات میں "اضلال و ہدایت" یا انکے ہم معنیٰ افعال کی نسبت پروردگار عالم نے اپنی ذات کی طرف دی ہے۔ انکا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ بندوں کے اندر ضلالت و ہدایت کو خلق فرماتا ہے بلکہ ان کے معانی کچھ اور ہیں جن کی بنا پر خداوند عالم کی صفت عدل میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ اور نہ وہ آیتیں۔ ان آیات کی مخالف و مناقض ظاہر ہوتی ہیں۔ جن میں جبر و اکراہ کی نفی کی گئی ہے اور بندوں کے اختیار و قدرت کو ثابت کیا گیا ہے اور چونکہ ان الفاظ کے ایک ہی معنیٰ ان تمام آیتوں میں مراد نہیں بلکہ ان میں سے کچھ آیتیں ایک معنیٰ پر مشتمل ہیں اور بعض دوسرے معنیٰ کو ظاہر کرتی ہیں۔ لہٰذا ہم ان آیات کی قسموں کو علیحدہ علیحدہ ذیل میں درج کرتے ہیں اور اس سے پہلے یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمارا مقصد ان معانی کو مختلف کہنے سے یہ نہیں ہے کہ ان سب میں اصل اور وضع ہی کے اعتبار سے اختلاف ہے بلکہ یہ مقصود ہے کہ اگرچہ بعض آیتیں اپنے معنی لغوی پر باقی ہیں پھر بھی مختلف وجہوں اور اعتباروں کے لحاظ سے دوسری آیتوں سے اختلاف رکھتی ہیں۔ اور پروردگار عالم نے ہر ایک آیت میں جداگانہ مقصود کو بیان فرمایا ہے۔

(پہلی قسم) کی وہ آیتیں ہیں جن میں ضلالت و ہدایت وغیرہ لفظوں کے معنی یہ نہیں ہیں کہ خداوند عالم ابتداً کسی کو گمراہ کرتا ہے اور کسی کو ہدایت بخشتا ہے بلکہ وہ ظاہر کرتی ہیں جب بندے اپنے ارادہ و اختیار سے کفر و فسق یا ایمان و تقویٰ پر قائم ہو جاتے ہیں تو عقاب و ثواب کے طور پر ایک سے اپنے مخفی الطاف و عنایات کو سلب کر کے فسق و ضلالت میں چھوڑ دیتا ہے۔ اور دوسرے کو اپنے پوشیدہ الطاف کے

ذریعہ اسکی اختیار کی ہوئی ہدایت میں زیادتی عطا کرتا ہے اور وہ آیتیں یہ ہیں :-

(۱) یضل بہ کثیراً ویھدی بہ کثیراً وما یضل بہ الا الفاسقین ۔ "اس مثل کی وجہ سے خدا بہتوں کو گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور بہتوں کی ہدایت کر دیتا ہے اور گمراہی میں صرف بدکاروں کو چھوڑ دیتا ہے ———"

اس آیت میں صاف طور سے بتا دیا کہ جو لوگ ہدایت حاصل کرنا چاہتے ہیں ۔ انکو خداوند عالم گمراہ نہیں بناتا بلکہ اس کا اضلال انھیں لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے جو پہلے سے باختیار خود فسق و فجور میں مبتلا ہوتے ہیں اور اس لئے انکو غضب و عذاب الٰہی کا استحقاق حاصل ہو چکا ہوتا ہے اور بعد میں الذین ینقضون عھد اللہ من بعد میثاقہ ویقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل ویفسدون فی الارض ۔ فرما کر ان فاسقوں کی بری خصلتوں کی تصریح بھی کر دی تاکہ بخوبی ظاہر ہو جائے کہ انھیں خصال بد کیوجہ سے اس نے اپنے پوشیدہ الطاف و عنایات کو سلب کر کے انھیں ضلالت میں چھوڑ دیا ہے ۔

(۲) ویضل اللہ الظالمین ۔ (ظالموں کو خدا گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے)

یہاں بھی صفت ظلم سبب بن گئی کہ خدا نے اپنے لطف خفی کو ان ظالمین کے شامل حال نہ کیا جن کی وجہ سے وہ گمراہی میں پڑے رہ گئے ۔

(۳) کذالک یضل اللہ من ھو مسرف کذاب (اسی طور سے خدا جھوٹے مسرف کو گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے)

اس جگہ بھی اسراف و کذب خود باعث بن گئے کہ وہ ضلالت میں پڑے رہ گئے ۔

(۴) ان اللہ لا یھدی القوم الکافرین (بیشک خدا کفر کرنے والے گروہ کی ہدایت نہیں کرتا)

اس آیت کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ خداوند عالم ادلہ و براہین کو بیان کر کے کفار کو ہدایت نہیں کرتا ۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ اس نے انبیاء و رسل کو بھیج کر کفار ہی کے سامنے دلائل و براہین پیش کئے تھے ۔ اور نہ یہ مطلب ہے کہ کافروں کے اندر ہدایت کو خلق نہیں فرماتا ۔ کیونکہ بے شمار کفار آج تک ہدایت یافتہ ہو چکے ہیں ۔ پس لامحالہ مقصود آیت یہی ہوگا کہ کفر پر اصرار کرنے والے کفار سے اپنے ان پوشیدہ الطاف کو سلب کر لیتا ہے جو ان کو ارادہ کرنے کی صورت میں مدد دیتے اور وہ منزل مقصود تک بسہولت پہونچ سکتے ۔

(۵) ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات یھدیھم ربھم بایمانھم ۔ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور نیکوکار بنے انکی ہدایت ان کا پروردگار ان کے ایمان کی وجہ سے کرے گا ۔

(۶) والذین اھتدوا زادھم ھدیً اور جن لوگوں نے ہدایت اختیار کی خدا نے انکی ہدایت میں اضافہ کر دیا ۔

(۷) ومن یؤمن باللہ یھد قلبہ ۔ اور جو شخص اللہ پر ایمان رکھے گا تو خدا اسکے دل کی رہنمائی کرے گا ۔

(دوسری قسم) ان آیتوں کی ہے جن میں "اضلال" سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم آخرت میں کفار کو انکی قطع حجت کر کے مبہوت کر دے گا ۔ ان میں سے ایک آیت یہ ہے ۔

ثم قیل لھم این ما کنتم تشرکون من دون اللہ قالوا ضلوا عنا بل لم نکن ندعوا من قبل شیئاً کذالک یضل اللہ الکافرین (مومن) "پھر ان سے پوچھا جائے گا کہ خدا کے سوا جن کو اسکا شریک بناتے تھے (اس وقت) کہاں ہیں ۔ وہ کہیں گے کہ اب تو وہ ہم سے جاتے رہے بلکہ ہم تو پہلے ہی سے (سوائے خدا کے کسی چیز کی پرستش نہیں کرتے تھے ۔ یوں خدا کافروں کو بوکھلا دے گا ———"

(تیسری قسم) ان آیات کی ہے جن میں "اضلال" سے ہلاک اور باطل کر دینا مراد ہے ان میں سے ایک آیت یہ ہے ۔

الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ اضل اعمالھم "جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور راہِ خدا سے روگردانی کی اللہ نے ان کے اعمال کو اکارت کر دیا ———"

اور عرب لفظ "ضلال و اضلال" کو ہلاک و معدوم ہو جانے کے معنی میں عموماً استعمال کرتے تھے چنانچہ کہتے تھے "ضل الماء فی اللبن" یعنی پانی دودھ میں مستہلک ہو گیا ۔ "اضل القوم میتھم" یعنی لوگوں نے میت کو قبر میں دفن کر کے دنیا سے نیست و نابود کر دیا ۔ قرآن میں بھی اس تفصیل بیان سے جہاں یہ امر واضح ہو گیا کہ کسی آیت میں اضلال و ھدایۃ سے خلق ضلالت و ہدایت مراد نہیں ہے وہاں مخالفین اسلام کا یہ اعتراض بھی دفع ہو گیا کہ "آیات قرآن کے مطالب میں تناقض ہے کیونکہ کسی آیت میں ہدایت کا عام ہونا مذکور ہے اور کسی میں یہ کہا ہے کہ خدا کفار کو ہدایت نہیں کرتا ۔ اسی طرح کہیں یہ کہا ہے کہ خدا بندوں کو گمراہ کر دیتا ہے ۔ اور دوسری جگہ یہ بتایا ہے کہ ضلالت و ہدایت خود انھیں کا اختیاری فعل ہے وہ اپنی مرضی سے جسکو چاہیں اختیار کریں ۔"

مجمع البیان میں اضلال کے ایک اور معنی درج ہیں جسکی تعبیر امتحان کی سختی سے کی جا سکتی ہے ۔ (طالب علم ناکام خود ہوتا ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ ممتحن نے فیل کر دیا) کھرا کھوٹا جانچنے کیلئے کھوٹے کو آگ میں گلاتے ہیں ۔ مگر لوگ کہتے ہیں کہ تم نے اپنا سونا کھوٹا کر دیا ۔ عرب کہتے ہیں فلان اضل ناقتہ (فلاں نے اپنا اونٹ گم کر دیا) مگر یہ نہیں مقصد ہوتا کہ مالک نے بالارادہ گم کر دیا ۔

(۴) فسق کے معنی لغت میں "خروج (یعنی باہر ہو جانے) کے ہیں اور اصطلاح شریعت میں "فاسق" اس شخص کو بتایا گیا ہے جو خدا کی طاعت اور فرمانبرداری سے باہر ہو جائے اور اس لفظ کا استعمال قرآن مجید میں

کہیں "ایمان" کے مقابلہ میں کیا گیا ہے۔ اور اس سے کفر مراد ہے اور کہیں جگہ ورع و تقویٰ کے مقابلہ میں کیا گیا ہے اور وہاں حدود شرعیہ سے باہر ہو جانا اور محرمات کا مرتکب ہونا مراد ہے۔

(۵) ینقضون عہد اللہ میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ وہ عہد مراد ہے جو خداوند عالم نے جملہ بنی آدم سے عالم ارواح میں لیا تھا۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ وہ خاص عہد و پیمان مراد ہے جو بنی اسرائیل سے لیا تھا۔ اور دونوں کا بیان آئندہ کیا جائیگا۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (ترجمہ) وہی (خدا) وہ ہے جس نے تمہارے نفع کیلئے زمین کی کل چیزوں کو پیدا کیا پھر آسمان کیطرف متوجہ ہوا۔ تو سات آسمان ہموار (و مستحکم) بنا دئے اور وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔"

(۱) "استویٰ" کے ساتھ کبھی "الیٰ" اور کبھی "علیٰ" استعمال کیا جاتا ہے۔ پہلی صورت میں وہ "قصد" (متوجہ ہوا) کے معنیٰ دیتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی کام کی طرف قصد کرتا تھا تو "استویٰ الیہ" کہتے تھے۔ اور دوسری صورت میں "استویٰ" اور "غلب" (چھا گیا اور غالب ہوا) کا مرادف ہوتا ہے۔ اور "استویٰ علی الشیٔ" کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ کسی شے پر غالب ہوا جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے ؎

فلما علونا و استوینا علیہمِ   ترکناہم صرعیٰ لنسر و کاسر

(پس جب ہم انپر غالب ہوئے اور چھا گئے تو ہم نے انکو طیور و حوش کے کھانے کیلئے پچھڑا ہوا بنا دیا) اور یہی معنیٰ آیۂ "الرحمٰن علی العرش استویٰ" میں مراد ہیں جو آئندہ آئے گا۔

(۲) اس مقام پر مخالفین اسلام کی طرف یہ شبہ پیش کیا جاتا ہے کہ قرآن مجید کا بیان خلقت آسمان و زمین کے متعلق مختلف ہے۔ کہیں تو یہ کہا جاتا ہے کہ خداوند عالم نے زمین کو آسمان سے پہلے پیدا کیا جیسا کہ آیہ زیر بحث اور دیگر آیات سے بھی ظاہر ہے اور کسی آیت میں اسکے برخلاف آسمان کی خلقت کا زمین کی پیدائش پر مقدم ہونا مذکور ہے اور وہ آیت یہ ہے۔

ءَأَنتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَاءُ بَنَاهَا رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوَّاهَا وَأَغْطَشَ لَيْلَهَا وَأَخْرَجَ ضُحَاهَا وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَٰلِكَ دَحَاهَا"

کیا تمہارا پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا آسمان کا۔ کہ اسی نے اسکو بنایا اور اسکی چھت کو خوب اونچا رکھا اور اسے درست کیا اور اسکی رات کو تاریک اور دن کو) اسکی دھوپ ظاہر کی اور اسکے بعد زمین کو پھیلایا

اس شبہ کی بنا محض یہ ہے کہ "ثم" حرف عطف عموماً ترتیب و تراخی کے معنیٰ دیتا ہے حالانکہ ایسا نہیں بلکہ کبھی فقط تعداد ظاہر کرنے کیلئے آتا ہے وہاں کسی امر کا دوسرے پر زمانے کے اعتبار سے مقدم ظاہر کرنا

مقصود نہیں ہوتا۔ جیسا کہ علم نحو کی کتابوں سے معلوم ہو سکتا ہے پس جہاں آسمانوں کی خلقت کا ذکر "ثم" کے ساتھ ہوا ہے۔ وہاں وہ دوسرے حرف عطف واو کے معنیٰ میں ہے۔ یعنی یہ ظاہر کرنا مقصود نہیں کہ آسمان کی خلقت زمین کے بعد واقع ہوئی بلکہ محض نعمات کی تعداد بدون لحاظ تقدم و تاخر زمانی بیان کر دی گئی ہے اور اسکی مثال کہ "ثم" کبھی محض بیان عدد کیلئے مستعمل ہوتا ہے۔ بغیر لحاظ ترتیب علاوہ کلام عرب کے خود قرآن مجید میں بھی دوسری جگہ موجود ہے۔

(۳) قرآن مجید اور احادیث کی تصریحات کے بموجب اہل اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ آسمانوں کا وجود یقینی ہے اور انکی تعداد سات ہے۔ لیکن وہ تصریحات فلسفۂ قدیم و جدید دونوں کے مسلمات کے خلاف ہیں اس لئے کہ فلسفۂ قدیم میں بجائے سات کے ۹ آسمانوں کے وجود کا دعویٰ کیا گیا ہے اور فلسفۂ جدید کے علمبردار کو آسمانوں کا وجود بالکل تسلیم ہی نہیں ہمکو فلسفۂ قدیم کی مخالفت سے یہاں تعارض کرنے کی ضرورت نہیں۔ خصوصاً اس لئے کہ اسلامی شریعت نے علاوہ ۷ آسمانوں کے عرش و کرسی کا وجود بھی بیان کیا ہے اور ان دونوں کو شامل کر لینے کے بعد ۹ کا عدد پورا ہو جاتا ہے۔ اور مخالفت باقی نہیں رہتی۔ البتہ فلسفۂ جدید کے انکشافات سے جو مخالفت ظاہر ہوتی ہے اس سے کسیقدر بحث کرنا چاہتے ہیں مگر اصل مقصود سے پہلے دو باتوں کو مقدمہ کے طور پر درج کرتے ہیں انکو بخوبی سمجھ لینا چاہئے کیونکہ ان سے بہت سے پیچیدگیاں اس طرح کے مسائل میں برطرف ہو جائیں گی۔

(پہلا مقدمہ) شریعت کی جن خبروں پر اسلامی عقائد کی بنیاد قائم ہے ان کی دو قسمیں ہے ایک متواتر کہی جاتی ہے اور دوسری مشہور۔ متواتر اس خبر کو کہتے ہیں جسکا شریعت میں وارد ہونا علم یقینی و اطمینان کلی کی حد میں پہونچ چکا ہو۔ اور مشہور وہ خبر کہی جاتی ہے جسکے وارد شریعت ہونے کا ثبوت یقینی کے مرتبہ سے تو کسیقدر کم ہو مگر ظن کے درجہ سے بالاتر ہو۔ اخبار احاد پر کسی عقیدہ کی بنیاد قائم نہیں کی جا سکتی پھر معنیٰ پر دلالت کرنے کے اعتبار سے ان دونوں متواتر مشہور خبروں کی دو حالتیں ہوتی ہیں۔

ایک تو یہ کہ وہ جس معنیٰ کو ظاہر کرتی ہیں اسکے خلاف کسی دوسرے معنیٰ کا احتمال پیدا ہوتا ہی نہیں اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ جو معانی ان کے ظاہر الفاظ سے سمجھ میں آتے ہیں وہ کسی دلیل عقلی قطعی کے خلاف نہ ہوں۔ اور ایسی خبریں کسی تاویل و توجیہ کو قبول نہیں کرتیں۔ لہٰذا ان کو معنیٰ ظاہر کے علاوہ کسی دوسرے معانی کیطرف پھیرنا ہرگز جائز نہیں ہو سکتا۔ اور دوسری حالت یہ ہوتی ہے کہ ان کے معنیٰ ظاہر کے علاوہ دوسرے معنیٰ کا بھی احتمال ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ احتمال بعید ہی کیوں نہ ہو پس

maablib.org

وہ معنی جو ظاہر لفظ سے سمجھے جاتے ہیں اگر کسی دلیل عقلی قطعی کے خلاف ہوں تو انکو چھوڑ کر اس معنی محتمل کیطرف رجوع کرنا لازم ہوگا تاکہ اس خبر کے معنی اور دلیل عقلی میں مطابقت ہو جائے ۔ اور اگر ایسا نہ کیا جائیگا تو عقل کے حکم قطعی کی مخالفت لازم آئے گی جسکو چھوڑ کر اصل توحید و نبوت ہی کا ثبوت محال ہو جائے گا کیونکہ وہ حکم عقل اور دلیل عقلی ہی منحصر ہے اور اگر اس خبر کے معنی ظاہر کسی دلیل عقلی کے مخالف نہ ہوں تو بے ضرورت دوسرے معنی محتمل کیطرف رجوع کرنا جائز نہ ہوگا۔

(دوسرا مقدمہ) شریعت اسلامی بلکہ تمام شرائع الٰہیہ کا مقصود فقط یہی ہے کہ وہ خلق کو معرفت و عبادت کیطرف ہدایت کریں۔ اور وہ طریقے بتائیں جن سے معاش و معاد کے احوال کی اصلاح ہو سکتی ہو رہے وہ علوم جو عالم و موجودات عالم کی خلقت اور دیگر احوال سے متعلق ہیں تو ان کے مباحث کی تفصیل و تشریح کرنا کسی شریعت کا مقصد اصلی نہیں ہوتا۔ البتہ جتنی باتیں ان کی غرض اصلی کے پورا ہونے کیلئے ضروری ہوتی ہیں وہ اجمال کے ساتھ بیان کر دی جاتی ہیں اور کہیں کہیں بقدر ضرورت تفصیل بھی کر دیجاتی ہے۔ پس شریعت محمدیہ میں آسمان و زمین اور ان کے موجودات کی بابت جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ زیادہ تر مجمل ہے ۔ مفصل کیفیات بہت کم مذکور ہیں ۔ اور اسکا سبب یہی ہے کہ فلسفہ و حکمت کے تمام مباحث کا مستقلاً بیان کرنا اسکا اصل مقصود نہیں ہے بلکہ غرض اصلی یہ ہے کہ خداوند عالم کے وجود و صفات پر دلائل عقلیہ سے استدلال کیا جائے اور اسکے لئے وہی اجمال کافی ہے البتہ جہاں ضرورت ہوئی فی الجملہ تفصیل بھی کر دی گئی ہے۔

ان مقدمات پر غور کر لینے کے بعد یہ معلوم کر لینا چاہیئے کہ قرآن و احادیث متواترہ و مشہورہ کے بموجب اہل اسلام فقط یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ سات آسمان خداوند عالم نے خلق فرمائے ہیں ۔ باقی یہ تفصیلات کہ ان میں کوئی رنگ ہے یا نہیں حرارت و برودت وغیرہا کیفیات ان میں موجود ہیں یا وہ سب سے خالی ہیں ۔ ستارے ان میں جڑے ہوئے ہیں یا ان سے علیحدہ فضا میں معلق ہیں ؟ تو اسکا ان کو نہ کچھ انکار ہے ۔ نہ اقرار کیونکہ قرآن مجید ان تمام کیفیات و حالات کے ذکر سے خالی ہے ۔ اور احادیث میں بھی بعض کیفیتوں کا تو مطلقاً ذکر نہیں کیا گیا ہے اور بعض ان احادیث میں مذکور ہیں جو احاد ہیں جن پر کسی عقیدہ کی بنیاد قائم نہیں کی جا سکتی۔

آسمان کے وجود سے انکار کرنے والوں نے اسوقت تک کوئی وجہ انکار سوائے اس کے بیان نہیں کی کہ رصد خانوں اور دوربینوں کے ذریعہ سے اسکو محسوس نہیں کر سکے ہیں ۔ انھوں نے فقط اتنا دیکھا ہے کہ ستارے ایک غیر متناہی خلاء و فضا میں ایک کشش ثقل کے ذریعہ قائم ہیں ۔ حالانکہ محض اتنی بات کو

وجہ انکار قرار دینا کئی وجہوں سے درست نہیں ہے

(پہلی وجہ) جبکہ خلاء و فضا کو غیر متناہی تسلیم کر لیا ہے تو یہ پھر دعویٰ کیسا کہ ہم نے اس کے تمام موجودات کو دیکھ لیا ہے ۔ پس ہمارے مشاہدے میں آئی ہوئی چیزوں کے علاوہ کوئی شئے موجود نہیں ہے ؟ ممکن ہے کہ اس فضا میں وہ ساتوں آسمان ایسے مقامات پر موجود ہوں ۔ جہاں تک رصد خانوں اور دوربینوں کے ذریعے نظر کی رسائی نہ ہو سکتی ہو۔ قرآن مجید میں صرف آسمانوں کا موجود ہونا مذکور ہے ۔ رہا یہ امر کہ وہ کتنی بلندی پر واقع ہیں ۔ اور زمین سے انکا فاصلہ کتنا ہے تو اسکا ذکر نہیں کیا گیا ہے ۔ اگر یہ خیال ہو کہ سورۂ سجدہ کی اس آیت ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ میں وہ مسافت بیان کر دی گئی ہے جو زمین و آسمان کے درمیان ہے تو یہ خیال غلط ہے کیونکہ اس آیت میں زمین و آسمان کا فاصلہ نہیں بتایا گیا ہے بلکہ قیامت کے دن کی مقدار ظاہر کی گئی ہے ۔ کہ وہ ہمارے شمار کے مطابق ہزار برس کے برابر ہوگا۔

بالجملہ اگر خلاء و فضا کو غیر متناہی تسلیم کیا جاتا ہے تو اس دعوے کو چھوڑ دینا چاہیئے کہ اس کے تمام حدود اور جملہ موجودات محسوس کر لئے گئے ہیں کوئی حد ایسی باقی نہیں رہی ہے جس میں کسی شئے کے موجود ہونے کا احتمال ہو سکے ۔ دونوں متضاد دعوے کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتے ۔ اور کم سے کم یہ ثابت کر دینا لازم ہے کہ رصد خانوں اور دوربینوں کے ذریعے غیر متناہی کا بھی ادراک کر لینا ممکن ہے ۔

(دوسری وجہ) ممکن ہے کہ آسمانوں میں کوئی رنگ موجود ہی نہ ہو اور اگر کوئی رنگ پایا بھی جاتا ہو تو ایسا کہ لاکھوں میل کے فاصلے سے محسوس و ممتاز نہ ہو سکتا ہو ۔ لہٰذا یہ احتمال بالکل درست ہے کہ ارباب رصد نے انکو بھی دیکھا ہو مگر خلاء و فضا سے ممتاز نہ کر سکے ہوں جبکہ انسان کی آنکھیں گرد و پیش کی چیزوں کے ادراک و تمیز میں خطا کرتی ہیں ۔ اور یہ غلطی و خطا ان کا نا قابل انکار خاصہ ہے تو پھر رصد خانوں اور دوربینوں کے وسیلہ سے دیکھنے میں بھی اس سے خالی نہیں ہو سکتیں ۔ آخر کس دلیل سے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ دوربینوں سے خطائے نظری ناممکن ہو جاتی ہے حالانکہ قوت باصرہ کے محسوسات میں جن جن اسباب سے عقل غلط حکم کرتی ہے وہ رصد خانوں اور دوربینوں کے ذریعہ ادراک کرنے کی حالت میں بھی موجود ہوتے ہیں پس وہ حکم عقل کی غلطی یہاں بھی موجود ہو گی ۔ مثلاً کشتی میں بیٹھے ہوئے آدمی کو دریا کے کنارے اور وہاں کی ساکن چیزیں متحرک نظر آتی ہیں ۔ اور چلتے ہوئے ابر میں ستارے تیزی سے دوڑتے دکھائی دیتے ہیں ۔ پس یہ خطائے نظری حالات مذکورہ میں دوربینوں سے دیکھنے میں باقی رہتی ہے ۔ پھر یہ دعویٰ کیونکر درست ہو سکتا ہے کہ فضا کے جو موجودات زمین سے لاکھوں میل کے فاصلہ پر واقع ہیں ان کی تمام کیفیات و اثنا بغیر خطائے نظری کے صحیح طور سے محسوس ہو گئے ہیں ۔ بالجملہ کسی شئے کا محسوس و مرئی نہ ہونا اس کے موجود نہ ہونے کی دلیل

نہیں ہوسکتا۔ ورنہ ان بے شمار ایسی چیزوں کا انکار لازم ہوجائے گا جن کا وجود ثابت ہے مگر دیکھنے میں نہیں آتی ہیں۔ خصوصاً اس اثیر (ایتھر) کے وجود کا انکار کر دینا پڑیگا جس کی بابت یہ اقرار کیا جاتا ہے کہ وہ فضائے عالم میں بھرا ہوا ہے۔ مگر محسوس و مرئی نہیں ہوتا۔

ستاروں کا محل ہماری اس تحریر سے یہ بھی ثابت ہوا کہ دوربینوں کے ذریعہ سیارات کا فضا میں معلق نظر آنا اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ وہ فی الواقع آسمان سے جدا ہیں بلکہ ممکن ہے کہ وہ آسمانوں میں لگے ہوئے انھیں افلاک جزئیہ اور دائروں پر گردش کر رہے ہوں جن کا ذکر قدیم علم ہیئت میں کیا گیا ہے۔ اور چونکہ آسمان کے طبقات محسوس و ممتاز نہیں ہوتے۔ وہ سیارات محض فضا میں گھومتے نظر آتے ہیں۔ اور اس کلام سے ہمارا مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ جو دلیل ستاروں کو آسمان سے الگ ثابت کرنے کیلئے پیش کی جاتی ہے۔ وہ اس مطلب کے ثابت کرنے کیلئے بالکل ناکافی ہے۔ ورنہ فی الواقع ہم کو اس سے نہ کچھ انکار ہے نہ اقرار۔ کیونکہ قرآن اور متواتر و مشہور حدیثوں سے ستاروں کا آسمانوں میں مرکوز ہونا اور نہ ہونا کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا۔ ان میں زیادہ سے زیادہ یہ مذکور ہے کہ خداوند عالم نے ستاروں سے آسمانوں کو زینت دی ہے اور اس سے مقصود ہماری نگاہوں میں زینت دینا ہے۔ پس ظاہر ہے کہ یہ تزئین اسی پر موقوف نہیں کہ ستارے آسمان میں جڑے بھی ہوں۔ بلکہ اس کے نیچے فضا میں معلق ہونے کی صورت میں بھی حاصل ہوسکتی ہے۔"

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ (ترجمہ) اور (اے رسول تم لوگوں سے اسوقت کا ذکر کرو) جبکہ تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں (اپنا) ایک نائب بنانیوالا ہوں تو انھوں نے کہا کہ کیا تو زمین میں ایسے کو پیدا کریگا۔ جو وہاں فساد اور خونریزیاں کرے حالانکہ ہم تیری تسبیح حمد کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور تیرے لئے پاکیزگی ثابت کرتے ہیں۔ تو خدا نے فرمایا کہ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔"

اس آیت میں کئی مسائل قابلِ ذکر ہیں اور وہ یہ ہیں:۔

(پہلا مسئلہ) یہ آیت آیات سابقہ سے باعتبار نظم و ترتیب کے پورا اتصال رکھتی ہے اور وہ اس طرح کہ یہاں تک ان نعمتوں کا مسلسل تذکرہ کیا گیا ہے جو تمام بنی آدم پر عام ہیں۔ پہلے نعمت حیاۃ مذکور ہوئی۔ پھر زمین و آسمان اور ان کے موجودات کا ذکر کیا گیا۔ اور بتادیا گیا کہ وہ سب کے سب انسان ہی کے لئے

خلق کئے گئے ہیں۔ پھر اس فضل و شرف کا ذکر شروع کیا۔ جو ابو البشر آدم علیہ السلام کو عطا کیا گیا تھا اور ظاہر ہے کہ ان کی تعظیم تمام بنی آدم کے لئے انعام عام اور وجہ شرف و عزت تھی۔ پس ابتدائے آیت میں جملہ "اذْكُرْ لَهُمْ" مقدر ہے یعنی اے رسول تم لوگوں سے اسوقت کا ذکر کرو جبکہ خدا نے ملائکہ سے کہا تھا کہ ہم زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والے ہیں الخ (اگرچہ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ صرف جملہ "اُذْكُرْ يَا مُحَمَّدُ" مقدر مانا جائے یعنی اے رسول تم خود اس وقت کو یاد کرو تاہم اسکا منشا بھی وہی ہے جو پہلے مذکور ہوا۔)

(دوسرا مسئلہ) قرآن و احادیث کے بیان کے بموجب اہل اسلام کا عقیدہ فرشتوں کی بابت یہ ہے کہ وہ لطیف و نورانی جسم رکھنے والے مخلوق ہیں۔ اور مختلف صورتوں میں متشکل ہونے کی قابلیت رکھتے ہیں جسوقت جیسی صورت و شکل بمقتضائے مصلحت مناسب ہوتی ہے خداوند عالم انہیں پیدا کر دیتا ہے چونکہ اثیر (ایتھر) اور ہوا کا وجود مسلم ہے حالانکہ وہ دکھائی دینے کے قابل نہیں تو محض مرئی نہ ہونے کی وجہ سے ملائکہ کے وجود کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ممکن ہے کہ وہ بھی اثیر اور ہوا کی طرح نہایت لطیف مادہ سے خلق کئے گئے ہوں۔ جس سے ان کے اجسام اصلیہ قابل مشاہدہ نہ ہوں۔ اور مختلف صورتوں کو قبول کرنا، کمال سرعت کیساتھ دور دراز مسافت کو طے کر جانا وغیرہ وغیرہ ان کے خواص میں سے ہوا۔ جس طرح حس و حرکت اور دیگر قوائے ظاہرہ و باطنہ ان اجسام کے خواص ہیں جو عناصر کثیفہ سے مرکب ہوتے ہیں۔

(تیسرا مسئلہ) قرآن مجید میں فرشتوں کے متعدد اور مختلف اوصاف بیان کئے گئے ہیں جنکی تشریح آئندہ مناسب مواقع میں کی جائیگی۔ یہاں امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک خطبہ کے چند فقرے نقل کئے جاتے ہیں جن کی بابت امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں "اعلم انہ لیس بعد کلام اللہ وکلام رسولہ کلام فی وصف الملائکۃ اعلیٰ واجل من کلام امیر المومنین علی علیہ السلام" یعنی تم جان لو کہ وصف ملائکہ میں خدا و رسول کے کلام کے بعد امیر المومنین علیہ السلام کے کلام سے بہتر و برتر تو کوئی کلام نہیں۔

اوصافِ ملائکہ ثم فتق ما بین السماوات العلیٰ فملأھن اطواراً من ملائکتہ فمنھم سجود لا یرکعون ورکوع لا ینتصبون وصافون لا یتزایلون ومسبحون لا یسأمون لا یغشاھم نوم العیون ولا سھو العقول ولا فترۃ الابدان ولا غفلۃ النسیان ومنھم امناء علیٰ وحیہ والسنۃ الیٰ رسلہ

"پھر بلند آسمانوں کے درمیان فضاؤں کو شگافتہ کیا اور انھیں مختلف انداز کے فرشتوں سے بھر دیا۔ چنانچہ ان میں سے کچھ ایسے ہیں کہ سجدے میں ہیں تو انھیں رکوع سے کوئی واسطہ نہیں اور رکوع میں ہیں تو انھیں قیام سے کوئی لگاؤ نہیں۔ صف بستہ ہیں تو اپنی جگہ سے ہٹتے نہیں، مسلسل تسبیح پڑھ رہے ہیں ذرا بھی تھکتے نہیں نہ ان کی آنکھوں میں نیند کا غلبہ ہوتا ہے۔

ومختلفون بقضائه وامره ومنهم الحفظة لعباده والسدنة لابواب جنانه ومنهم الثابتة في الارضين السفلى اقدامهم والمارقة من السماء العليا اعناقهم والخارجة من الاقطار اركانهم والمناسبة لقوائم العرش اكتافهم ناكسة دونه ابصارهم متلفعون باجنحتهم مضروبة بينهم وبين من دونهم حجب العزة واستار القدرة لا يتوهمون ربهم بالتصوير ولا يجرون عليه صفات المصنوعين ولا يحدونه بالاماکن ولا يشيرون اليه بالنظائر۔

نہ انکی عقلوں پر سہو کا حملہ نہ ان کے جسموں میں کبھی سستی پیدا ہوتی ہے اور نہ ان پر کبھی بھول والی غفلت طاری ہوتی ہے۔ انھیں فرشتوں میں سے کچھ وہ ہیں جو خدا کی وحی کے امین اور پیغمبروں کے لئے اللہ کی زبان ہیں۔ وہ خدا کے احکام اور فیصلے لے کر (زمین پر) آمد و رفت رکھتے ہیں۔ اور کچھ فرشتے وہ ہیں جو بندگان خدا کی حفاظت میں لگے ہوئے ہیں اور (کچھ) دروازہائے جنت کے نگراں بنے ہوئے ہیں۔ اور کچھ ایسے (عظیم الخلقت) فرشتے ہیں جنکے پاؤں تحت الثریٰ میں اور سر عرش اعلیٰ پر، اعضاء و جوارح ہر چہار سمت سے باہر اور شانے ستونہائے عرش کے برابر ہیں (پھر بھی) اس کی بارگاہ کے سامنے ان کی نگاہیں جھکی ہوئی اور (عاجزانہ انداز میں) ان کے بازو سمٹے ہوئے ہیں انکے اور خدا کے درمیان (نہ جانے کتنے) عزت اور قدرت کے حجاب اور پردے حائل ہیں۔ نہ وہ اپنے رب کو کسی شکل سے سوچ سکتے ہیں اور نہ مخلوقات کے صفات سے اسکی ذات کو متصف کر سکتے ہیں۔ نہ کسی جگہ کے ساتھ اسے محدود کر سکتے ہیں۔ اور نہ نگاہوں کے سہارے اسکی طرف اشارے کر سکتے ہیں۔

(چوتھا مسئلہ) "خلیفہ" عام طور سے اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کے بعد اسکا قائم مقام ہو۔ اور خلیفۃ اللہ وہ شخص ہوتا ہے جو خداوند عالم کی طرف سے خلق پر حکومت کرنے اور ان کی دینی و دنیوی امور کی اصلاح کیلئے مقرر کیا جائے۔ عام اس سے کہ وہ نبی و رسول بھی ہو یا نہ ہو۔ کیونکہ نبی وہ شخص ہوتا ہے جسپر وحی نازل کی جائے اور "رسول" وہ ہوتا ہے جو نزول وحی کے ساتھ کسی شریعت کو بھی جاری کرنے کیلئے مبعوث کیا جائے۔ لیکن خلیفہ کیلئے ان دونوں باتوں کی شرط نہیں ہے بالجملہ خلافت، نبوت۔ رسالت مختلف مراتب ہیں جو کبھی ایک ہی ذات میں جمع ہو جاتے ہیں اور کبھی علیحدہ علیحدہ پائے جاتے ہیں۔ مگر عصمت سب کے لئے لازم ہے۔ جیسا کہ ہم آئندہ تفصیل سے بیان کریں گے۔

(پانچواں مسئلہ) آیۂ زیر بحث اور اس آیت یَا دَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (اے داؤدؑ ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا ہے تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو) سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی شخص خود اپنی ریاضت نفس اور طاعت و عبادت یا خلق کے انتخاب سے خلیفۂ خدا اور حاکم خلق نہیں بن سکتا۔ بلکہ اسکا اختیار فقط خداوند عالم کو ہے۔ وہ جس میں

قابلیت و استعداد دیکھتا ہے خود منتخب کر لیتا ہے۔

(چھٹا مسئلہ) خلیفہ و حاکم مقرر کئے جانے کی خبر خود یہ ظاہر کر رہی ہے کہ خداوند عالم روئے زمین پر ایسی مخلوق پیدا کرنا چاہتا ہے۔ جس سے شر و فساد ظاہر ہوں گے۔ کیونکہ امیر و حاکم کی احتیاج انھیں مخلوقات کے لئے ہوتی ہے جن میں شر و فساد کا مادہ پایا جاتا ہو۔ اور ان کو انکی طبیعت و حالت پر چھوڑ دینے سے طرح طرح کے دینی و دنیوی مفاسد پیدا ہوتے ہیں۔ جن سے انکی خلقت کی اصلی غایت نہ پوری ہو سکتی ہو۔ اور چونکہ ایسے مبدا شر و فساد مخلوق کا پیدا کرنا ملائکہ کو بظاہر حکمت کے خلاف معلوم ہوا۔ لہٰذا اس مخفی راز اور پوشیدہ مصلحت کے دریافت کرنے کی غرض سے یہ سوال "اَتَجْعَلُ فِیْهَا الخ" پیش کیا۔ خود جناب آدم کی ذات کا تمام شر و مفاسد سے پاک ہونا اسی سے ظاہر تھا کہ ان کو خداوند عالم نے اپنا خلیفہ بنانے کی خبر دی تھی اور جبکہ ایک معمولی سے معمولی فہم رکھنے والے کو بھی یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ کسی مفسد و سفاک کو خداوند عالم اپنا خلیفہ مقرر کریگا۔ تو بھلا فرشتوں کی بابت یہ خیال کرنا کیونکر درست ہو سکتا ہے کہ وہ جناب آدمؑ کی ذات کو باعث فساد و خونریزی بتا رہے تھے؟

پس ان باتوں سے چند نتیجے حاصل ہوئے۔

(۱) فرشتوں کا سوال خود جناب آدمؑ کی بابت نہ تھا بلکہ اس آنے والی مخلوق کے متعلق تھا۔ جن کے طبعی شر و فساد کے انسداد اور تمام امور کی اصلاح کیلئے خود انکو خلیفہ و حاکم کرنے کی ضرورت ہوئی تھی۔ اور وہ سوال محض سوء ظن پر مبنی نہ تھا بلکہ اس کی بنا اس یقین پر قائم تھی۔ جو خداوند عالم کی اسی خبر سے انھیں حاصل ہوا تھا۔

(۲) یہ سوال ملائکہ نے اس مقصد سے پیش نہیں کیا تھا کہ خداوند عالم کے فعل پر اعتراض کریں، اور اسکو خلاف حکمت ٹھہرائیں۔ بلکہ انسانی خلقت کی حقیقی مصلحت و حکمت کو معلوم کرنا مقصود تھا۔ اور یہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ کسی کام کے حکمت سے خالی ہونے اور اسکے بظاہر خلاف حکمت نظر آنے میں بہت بڑا فرق ہے۔ اسی طرح خداوند عالم کے کسی کام کو حکمت سے خالی سمجھ کر اعتراض کرنا بے شک قبیح ہے مگر حقیقی مصلحت و حکمت ظاہر نہ ہونے کی وجہ سے اظہار و تعلیم کی درخواست کرنا کوئی قباحت نہیں رکھتا۔

(۳) پروردگار عالم نے خبر خلقت آدمؑ فرشتوں کو اس لئے نہیں دی تھی کہ ان سے مشورہ کا محتاج تھا۔ بلکہ اس سے مقصود یہی تھا کہ وہ اس جدید مخلوق کی بابت سوال کریں۔ اور جو اسرار اس خلقت میں مخفی تھے معلوم کر لیں۔ نیز یہ خبر اس حکم سجدہ کا مقدمہ تھی جو ان کو بعد میں دیا گیا۔

(۴) اوپر کے بیان سے یہ بھی واضح ہو گیا ہو گا کہ "اتجعل فیها الخ" سے مسئلہ تناسخ کی تائید نہیں ہوتی ہے (جیسا کہ آریہ کہتے ہیں) اس لئے خلیفہ و حاکم مقرر کئے جانے کی خبر خود یہ ظاہر کر رہی ہے کہ زمین

پر وہ ایسی مخلوق پیدا کریگا۔ جس سے شر و فساد ظہور پذیر ہوں گے۔ ہٰذا ملائکہ کے سوال سے یہ بالکل ظاہر نہیں ہوتا کہ پہلے بھی اس دنیا میں ہمارے جیسے انسان آباد تھے اور انھیں کشت و خون کرتے ہوئے ملائکہ دیکھ چکے تھے تاکہ اسے کھینچ تان کر تناسخ سے چسپاں کیا جا سکے۔

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هٰٓؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِينَ ○ قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ○ قَالَ يٰٓآدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ○

(ترجمہ) اور خدا نے آدم کو کل نام بتا دیئے پھر ان (ناموں کے مصداق) کو فرشتوں پر پیش کیا۔ اور فرمایا کہ اگر تم مطابق واقع بات کرتے ہو تو ذرا ان کے نام مجھے بتا دو، فرشتوں نے (عاجزی سے) عرض کی تو ہر عیب سے پاک ہے۔ ہمکو تو بس اتنا ہی علم ہے جو تونے بتا دیا ہے۔ بے شک تو بڑا جاننے والا اور مصلحتوں کا پہچاننے والا ہے (اسوقت) خدا نے آدم سے فرمایا کہ تم فرشتوں کو ان سبکے نام سے آگاہ کر دو۔ جب آدم نے فرشتوں کو ان کے نام بتا دیئے تو خدا نے فرشتوں سے فرمایا کیوں! میں تم سے کہتا تھا کہ میں آسمانوں اور زمینوں کے چھپے ہوئے راز کو جانتا ہوں اور جو کچھ تم اب ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم (پہلے) چھپاتے تھے (وہ سب) جانتا ہوں۔"

فرشتوں کا سوال یہ تھا کہ روئے زمین پر کسی ایسی مخلوق کے پیدا کرنے میں مصلحت کیا ہے درانحالیکہ ہم تیری تسبیح و تقدیس کے لئے موجود ہیں۔ پس ان کے جواب میں اجمالاً "انی اعلم ما لا تعلمون" فرمایا پھر اس کی توضیح یوں کی کہ جناب آدم کو تمام اسماء تعلیم کرکے ان کے سامنے پیش کئے تاکہ جناب آدم کی فضیلت اور وہ مصلحت ان کو معلوم ہو جائے جو بشری خلقت میں مخفی تھی۔

علم آدمؑ بعض مفسرین کی رائے ہے کہ جناب آدم کو حیوانات، نباتات وغیرہا اشیائے عالم کے نام تعلیم کئے گئے تھے۔ اور ہر قسم کی صنعت، استخراج معادن کے طریقے، درخت لگانے عمارت بنانے کے قاعدے بتلائے گئے تھے۔ اور بعض کا خیال ہے کہ تمام زبانیں جو عالم میں رائج ہونے والی تھیں۔ تعلیم کی گئی تھیں۔ لیکن یہ دونوں رائیں چند وجہوں سے صحیح نہیں۔

(پہلی وجہ) محض اشیائے عالم کے نام اور صفات و خواص یا تمام زبانوں کا علم حاصل ہو جانے سے جناب آدمؑ کو ملائکہ پر فضیلت نہیں حاصل ہو سکتی تھی۔ اور نہ ان باتوں سے ناواقف ہونا ملائکہ مقربین

کے لئے کسی نقص کا باعث تھا۔ جب ان کو نہ عالم کے تمدن میں شریک ہونا تھا اور نہ اشیائے عالم کے استعمال کی ان کو ضرورت لاحق ہوئی تھی۔ تو ان چیزوں کا معلوم ہونا اور نہ ہونا دونوں ان کے لئے برابر تھا

(دوسری وجہ) جناب آدم کی محض علمی فضیلت اور ادراکی فوقیت فرشتوں کے سوال کا جواب نہیں بن سکتی تھی۔ کیونکہ وہ مادہ شر و فساد سے متعلق تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ محض علم و ادراک کا کمال انسان کو شر و فساد سے باز رکھنے کیلئے کافی نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر تواریخ کی شہادت صحیح ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ علم و ادراک کی ترقی ہر زمانہ میں مادہ شر و فساد کی حیرت انگیز زیادتی کا سبب بنتی رہی ہے۔ نیز ہم نے اوپر بیان کیا کہ ملائکہ نے جناب آدم کی بابت اپنا سوال پیش نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ بنی آدم کے متعلق تھا۔ لہٰذا جناب آدم کی فضیلتوں کا اظہار اس سے بالکل مطابقت نہیں رکھتا۔ اگر بنی آدمؑ کی کوئی فضیلت فرشتوں پر ظاہر کی جاتی تو وہ البتہ اس کا جواب بن سکتی تھی۔

پس صحیح تفسیر اس آیت کی یہ ہے کہ جن ناموں کو ملائکہ کے سامنے پیش کیا تھا۔ وہ ان صالح بندوں کے تھے جو نسل آدم میں آئندہ پیدا ہونے والے تھے۔ ان کو ظاہر کرکے فرشتوں کو بتایا گیا کہ تمہارا سوال صحیح نہیں کیونکہ بنی آدم میں سب مفسد و سفاک نہ ہوں گے۔ بلکہ ان میں اکثر صالح و متقی بھی ہوں گے جن کا پیدا نہ کرنا خلاف مصلحت و حکمت ہوگا۔

دفع دخل کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ آدم کو علم مذکور خدا نے بتا دیا تھا۔ اور ملائکہ کو نہیں بتایا تھا تو ایسے علم کا سوال ملائکہ سے کرنا شانِ خدا سے بعید ہے۔ اس لئے جواد مطلق نے علم دونوں (آدم و ملائکہ) کو دیا تھا مگر ملائکہ نے اپنے علم کی حد خود بتا دی۔ کہ "جو تونے بتایا بس اتنا ہی ہمارا علم ہے" اس میں ہم کوئی اضافہ نہیں کرتے۔ کیونکہ تونے ہمکو وحدانی الصفۃ بنایا ہے۔ لیکن آدم کے علم میں استنباطی شان تھی جسکا ثبوت ان ہی آیات میں موجود ہے کیونکہ خدا نے آدم کو صرف اسماء کی تعلیم دی تھی لیکن مصداق و مسمّیٰ پر ان کو مطابق کرکے ملائکہ کے سامنے بیان کر دینا یہ آدم کی جامعیت صفات اور صلاحیت ذات کی بنا پر تھا۔ یہاں پر یہ کہنا بے عقلی ہوگی کہ دونوں کی استعداد کو یکساں کیوں نہ بنایا۔ فافہم۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِينَ ○ اور (اس وقت کو یاد کرو) جبکہ ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ تو سب کے سب جھک گئے مگر ابلیس نے انکار کیا اور غرور میں آگیا اور کافروں میں شامل ہو گیا۔"

(۱) ابلیس کی بابت دوسرے مقام پر قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ وہ مَلَک نہ تھا بلکہ جن تھا۔ اور متعدد آیات میں اسکا یہ قول "خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ" جو منقول ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ فرشتے نور سے پیدا کئے گئے ہیں نہ کہ نار سے مگر ظاہری طاعت و عبادت کیوجہ سے ملائکہ کے گروہ میں داخل ہو گیا تھا۔ اور وہ اسکو ایک ملک سمجھنے لگے تھے۔ غرضکہ گروہ ملائکہ میں شامل ہونے کی وجہ سے ابلیس بھی محکوم بہ سجدہ تھا۔

(۲) تمام اہلِ اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ جس سجدہ کا حکم دیا گیا تھا وہ سجدۂ عبادت نہ تھا۔ بلکہ سجدۂ تعظیم تھا چونکہ پروردگارِ عالم کو منظور تھا کہ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے جناب آدمؑ کی انتہائی تعظیم کی جائے اور سجدہ سے بڑھ کر کوئی صورت تعظیم کی نہ تھی اس لئے اسکا حکم دیا۔ اور اس بارے میں جو اہتمام بلیغ ملحوظ تھا۔ وہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرشتوں کو یہ حکم اس وقت دیا گیا تھا جبکہ جسم آدم میں روح داخل نہیں ہوئی تھی تاکہ وہ روح کے داخل ہوتے ہی سجدہ کیلئے جھک جائیں جیسا کہ اس آیت میں مذکور ہے "اذا سوّیتہ و نفخت فیہ من روحی فقعوا لہ ساجدین" اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سجود سے محض خضوع و انقیاد مراد نہ تھا۔ بلکہ زمین پر پیشانی رکھ دینا ہی مقصود تھا، اور چونکہ عبادت و تعظیم میں بڑا فرق ہے اور اس وقت وہ تعظیم بھی حسبِ خداوندعالم کے حکم سے کی گئی تھی جس کی تعمیل ہی میں خدا کی عبادت و اطاعت منحصر تھی۔ لہٰذا اس حکم کی نوعیت اور سجود کی حقیقت میں کسی شک و شبہ سے کام لینا بے محل ہے۔

(فائدہ):۔ کتب تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آدم ابوالانس ہیں اسی طرح ابلیس (جسکا اصلی نام حارث ہے) ابوالجن ہے۔ اس کے یہاں توالد و تناسل ہوتا ہے اور اسکی نسل کا ذکر تو قرآن میں بھی آیا ہے۔ مثلاً "افتتخذونہ و ذریتہ اولیاء من دونی" (کیا تم لوگ شیطان اور اس کی اولاد کو مجھے چھوڑ کر اپنا ولی بنا لوگے۔)

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ۝ ترجمہ:۔ "اور ہم نے آدم کو کہا کہ تم اپنی بی بی سمیت جنت میں رہو اور جہاں تمہارا جی چاہے اس میں بفراغت کھاؤ (پیو) مگر اس درخت کے پاس بھی نہ جانا ورنہ تم اپنا آپ نقصان کرنے والوں میں ہو جاؤ گے۔"

(۱) جس جنت میں آدمؑ و حواؑ ٹھہرائے گئے تھے اسکی بابت جناب صادق آل محمد علیہ السلام سے مروی ہے

انھا کانت من جنان الدنیا یطلع فیھا الشمس والقمر ولو کان من جنان الخلد ما خرج منھا ابداً (یعنی وہ دنیا کی ایک جنت تھی جس میں چاند سورج طلوع کرتے تھے اگر وہ جنت خلد ہوتی تو حضرت آدمؑ وہاں سے خارج نہ ہوتے۔) اور تفسیر قمی میں یہ فقرہ بھی مذکور ہے " ولم یدخلھا ابلیس" یعنی اس میں ابلیس داخل ہی نہ ہو سکتا۔

(۲) "شجرہ" کا ذکر آئندہ مفصّل آئے گا۔

فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ۝ (ترجمہ) "پس شیطان نے آدم و حوا کو وہاں سے ڈگمگایا اور انکو جس عیش و راحت میں تھے اس سے نکال پھینکا اور ہم نے کہا تم سب (زمین پر) اتر پڑو۔ تم میں سے بعض بعض کے دشمن ہونگے اور زمین میں تمہارے لئے ایک خاص وقت تک ٹھہراؤ اور ٹھکانا ہے۔"

اس آیت کی صحیح تاویل بیان کرنے سے پہلے چند باتوں کا لکھ دینا ضروری ہے:۔

(۱) شیعہ امامیہ کا عقیدہ انبیاء کی بابت یہ ہے کہ وہ بعثت کے پہلے اور اسکے بعد تمام عقائد و اعمال میں ہر طرح کی خطا و معصیت اور سہو و نسیان سے معصوم تھے اور متعدد عقلی اور نقلی دلیلوں سے انکے اس عقیدہ کی صحت ثابت ہوتی ہے۔ جن میں سے ایک دلیل یہاں نقل کی جاتی ہے اور وہ یہ ہے۔ بعثت انبیاء کی غرض و غایت یہ تھی کہ خلقِ خدا کو خدا کی معرفت و طاعت کیطرف رہنمائی کی جائے اور وہ طریقے بتائے جائیں۔ جن سے ان کے دینی و دنیوی امور کی اصلاح ہو سکتی ہو۔ شخصی و نوعی حالات خلل و فساد سے محفوظ رہ سکتے ہوں۔ اور یہ مقصود صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ انبیاء معصوم ہوں اور وہ اس لئے کہ غیر معصوم کی اطاعت و بیعت پر عوام الناس کے نفوس کبھی تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ پھر وہ مقصود کیونکر حاصل ہوتا۔ اس کا ثبوت کسی دلیل کا محتاج نہیں بلکہ ہر شخص اپنے وجدان و ضمیر کی طرف رجوع کر کے معلوم کر سکتا ہے کہ اگر اس کے پاس ایسا شخص ناصح و واعظ بنکر آئے جو خود گناہوں میں مبتلا ہو یا پہلے کسی وقت میں اسکا دامن معصیتوں سے آلودہ رہا ہو تو اسکی بات سننے اور اطاعت و فرمانبرداری پر رضامند نہ ہوگا۔ بلکہ سخت نفرت کریگا۔ پس ایسے وسائل سے کسی امر کا قصد کرنا جو اسکو فوت کر دینے والے ہوں۔ خدائے حکیم و علیم کا فعل نہیں ہو سکتا۔

نیز تجربہ شاہد ہے کہ جبوقت رئیس ملت و امیر قوم کے اخلاق و اعمال برے ہوتے ہیں تو رعیت کے نفوس کمال جرات کے ساتھ ہر طرح کے مفاسد پر راغب ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ مقولہ مشہور ہے کہ

اذا فسد العالم فسد العالم یعنی جب عالم کے اخلاق و اعمال فاسد ہوتے ہیں تو سارے عالم میں فساد پھیل جاتا ہے۔ پس جو انبیاء تمام امت کے حاکم اور مصلح بنا کر مبعوث کئے جاتے۔ اور وہی عیوب و نقائص میں مبتلا اور خطا و معصیت میں گرفتار ہوتے تو ان کی بعثت سے عوام الناس کو بجائے خیر و صلاح کے شر و فساد کی زیادہ رغبت ہوتی۔ ان کی پیروی کے حیلے سے ایسی برائیوں کی طرف بھی مائل ہو جاتے جنکی جرات پہلے نہ کرتے۔ پس ایسے وسیلوں سے اصلاح خلق کا قصد کرنا جو شر و مفاسد کو بڑھانے والا ہوں کسی حکیم کا فعل نہیں ہو سکتا۔

اس دلیل کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ نبی کا معصوم مبعوث کرنا ممکن ہے سراسر مصلحت و حکمت بھی۔ کیونکہ اسکی پیروی کرنے سے کسیکو نفرت نہیں ہو سکتی اور نہ اسکی اطاعت کسی کو معصیت کیطرف مائل کر سکتی برخلاف اس کے غیر معصوم کی بعثت میں یہ تمام خرابیاں موجود ہوتی ہیں لہٰذا عین مفسدہ اور سراسر قبیح ہوگی۔ پس معصوم کو چھوڑ کر غیر معصوم کو مبعوث کرنا خداوند عالم کے لئے [illegible] نہیں ہو سکتا۔ اور چونکہ نبی خدا کے انتخاب سے ہوتا ہے۔ لہٰذا معصوم ہونا بھی ضروری ہوگا ورنہ وہ انتخاب خلاف حکمت ہوگا۔

(۲) اس سے پہلے مذکور ہو چکا کہ جس امر پر دلیل عقلی قائم ہو چکی ہو اسکے خلاف جتنی چیزیں ہم تک پہونچیں گی۔ سب کی سب قابل تاویل ہوں گی اور ان کو ایسے معنوں کیطرف راجع کرنا واجب ہوگا جن سے اس دلیل عقلی کی مخالفت باقی نہ رہے۔ اور اس وقت تو اس وجوب میں کوئی شبہ ہو ہی نہیں [illegible] جبکہ ان خبروں کے خلاف دلیل عقلی کی موید دوسری خبریں بھی موجود ہوں۔

(۳) نہی کی قسمیں مختلف ہیں (اول) تحریمی، یعنی جسکی مخالفت مالک کے عقاب و غضب کا مستحق بناتی ہے۔ لہٰذا یہ مخالفت درحقیقت معصیت ہوتی ہے۔

(دوم) تنزیہی۔ اسکی مخالفت باعث استحقاق عقاب نہیں ہوتی۔ مگر مکلف کے حق میں اسکی تعمیل [illegible] مخالفت کے بہتر ضرور ہوتی ہے۔ کیونکہ مالک اسکو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس نہی کی [illegible] بھی مجازاً معصیت کہی جاتی ہے

(سوم) ارشادی۔ یہ نہی ان چیزوں سے کی جاتی ہے جو انسان کے لئے کسی حیثیت سے دنیاوی [illegible] مضر اور باعث مشقت ہوں۔ اس کی مثال وہ نواہی ہیں جو طبیب کی طرف سے مریض کو ضرر رساں چیزوں کے استعمال کی بابت کئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک نہی کی مخالفت پر محض اس اعتبار سے کسی شخص کی ملامت و مذمت کی جاتی ہے کہ اس نے ان ضرر پہونچانے والی چیزوں سے پرہیز نہ کیا اور اپنے نفس کو

مشقت میں ڈال دیا۔ اگر اسکی ذاتی مشقت و زحمت سے قطع نظر کر لی جائے تو اور کوئی وجہ ملامت باقی نہیں رہتی۔ اس نہی کی مخالفت پر بھی مجاز کے طور سے معصیت کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

ان تمام باتوں کے معلوم ہو جانے کے بعد یہ دیکھنا چاہیئے کہ جناب آدم کے مراتب کیا تھے اور کسی ایک شجرۂ جنت کا پھل کھانے سے جو نہی کی گئی تھی وہ کس قسم کی نہی تھی۔؟

آدم کی عصمت قرآن مجید کی کئی آیتوں سے آپ کا نبی معصوم ہونا ظاہر ہوتا ہے منجملہ ان کے آیت یہ ہے:۔

ان اللہ اصطفیٰ آدم و نوحًا و آل ابراھیم و آل عمران علی العالمین

بیشک اللہ نے آدم و نوح اور آل ابراہیم و آل عمران کو تمام عالموں پر برگزیدہ کیا۔

چونکہ اس آیت کریمہ میں انبیاء کرام کے ساتھ آپ کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور برگزیدہ کئے جانے میں ان سب کے شریک ظاہر کئے گئے ہیں اس لئے ثابت ہوتا ہے کہ آپ بھی نبی تھے۔ اور ثبوت نبوت کے ساتھ عصمت بھی ثابت ہو گئی۔ کیونکہ نبی کا معصوم ہونا لازم ہے۔ غیر معصوم نبی نہیں ہو سکتا جیسا کہ سابقاً مذکور ہوا نیز برگزیدہ کئے جانے کا مطلب ہی یہی ہے کہ آپ کو خدا نے نبوت و عصمت عطا کی تھی اسکے سوا "اصطفیٰ" کے کوئی معنی اور نہیں ہو سکتے۔

نہی کی نوعیت پس جبکہ ایک مقام پر قرآن مجید آپ کی نبوت و عصمت کی شہادت دے رہا ہے تو یقین کر لینا چاہیئے کہ اس شجرۂ جنت کے قریب جانے کی ممانعت نہی تحریمی نہ تھی اور آپ نے خلاف عصمت کسی معصیت واقعیہ کا ارتکاب نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ نہی تنزیہی یا ارشادی رہی ہوگی۔ بلکہ اس نہی کا ارشادی ہونا قرآن میں صاف طور سے مذکور ہے۔ دیکھو سورۂ طٰہٰ کی یہ آیت:۔

فقلنا یا آدم ان ھٰذا عدو لک ولزوجک فلا یخرجنکما من الجنۃ فتشقٰی ان لک ان لا تجوع فیھا ولا تعریٰ وانک لا تظمؤا فیھا ولا تضحیٰ۔

تو ہم نے (آدم سے) کہا کہ اے آدم یہ (شیطان) یقینی تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے تو کہیں تم دونوں کو بہشت سے نہ نکلوا چھوڑے تو تم دنیا کی مصیبت میں پھنس جاؤ۔ لاریب کہ بہشت میں تمہیں یہ (آرام) ہے کہ تم یہاں بھوکے رہو گے اور نہ ننگے اور نہ یہاں پیاسے رہو گے نہ دھوپ کھاؤ گے۔"

جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ نہی محض آپ کی مشقت کے لحاظ سے کی گئی تھی کیونکہ جنت میں بے مشقت کسب و طلب کھانے۔ پینے۔ پہننے کا سامان مہیا تھا اور دیگر اسباب راحت موجود تھے۔ وہاں سے باہر آکر اپنی ذات اور اپنی زوجہ کے لئے اسباب معیشت و راحت بہم پہونچانا۔ بے زحمت و مشقت ممکن نہ تھا

اگر وہ نہی تحریمی ہوتی جسکا انجام بد غضب وعقاب الٰہی ہوتا ہے۔ اور یہ احتمال ہوتا کہ ابلیس آپ کے نفس پر غالب آکر معصیت قبیحہ اور غضب الٰہی میں مبتلا کر سکے گا۔ تو عداوت ابلیس پر متنبہ کرتے ہوئے اسکی تصریح کر دینا ضروری ہوتا۔ کیونکہ اس سے پروردگار عالم کی حجت جناب آدم پر واضح طور سے تمام ہو جاتی۔ پس ثابت ہوا کہ وہ نہی محض ارشادی تھی اور اسکی مخالفت کے بعد جنت سے خارج کیا جانا عقاب وعذاب کے طور پر نہ تھا۔ بلکہ اسکی وجہ یہ تھی کہ اب مصلحت وہاں کے قیام کی مقتضی نہ تھی۔ اور جہاں جہاں ظلم وشقاوت یا معصیت وغوایت کا ذکر کیا گیا ہے اس سے فقط نہی ارشادی کی مخالفت مقصود ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ جناب آدم نے خداوند عالم کی نصیحت کے برخلاف ابلیس کے فریب میں آکر اپنی نفس کو جنت کی راحت ونعمت سے محروم کر لیا اور دنیا کی محنت ومشقت میں ڈالدیا۔

تنبیہ:۔ اھبطوا کی توضیح عنقریب آتی ہے۔

فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۝

پھر آدم نے اپنے رب کی طرف سے (معذرت کے) چند الفاظ سیکھے۔ پس خدا نے (ان الفاظ کی برکت سے) آدم کی توبہ قبول کر لی۔ بیشک وہ بڑا معاف کرنے والا مہربان ہے۔

(۱) "تَابَ" کے معنی "رَجَعَ" کے ہیں (یعنی اس نے رجوع کی) اور یہ لفظ مالک وعبد دونوں کے درمیان مشترک استعمال کی جاتی ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ جس وقت بندہ کی طرف منسوب ہو تو "الیٰ" کے ساتھ استعمال کیجاتی ہے اور مالک کے لئے "علیٰ" کے ساتھ۔

(۲) جناب آدم کی توبہ اور طلب مغفرت اور پروردگار عالم کا اسکو قبول کرنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ آپ نے کسی معصیت کا ارتکاب کیا تھا۔ بلکہ اس توبہ واستغفار کی حقیقت یہ ہے کہ انبیاء وعرفا کی دلی خواہش یہی ہوتی ہے کہ پروردگار عالم کے کسی امر ونہی کی تعمیل میں قطعاً خلل نہ واقع ہو۔ عام اس سے کہ ان سے ایجاب وتحریم مقصود ہو۔ یا محض استحباب وکراہت اور ارشاد ونصیحت۔ پس اگرچہ آپ سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا تھا۔ لیکن ایک نہی الٰہی کے منشاء پر قائم رہنے میں کوتاہی ضرور ہوئی تھی۔ جس کو آپ نے اپنی حیثیت اور پروردگار عالم کی عظمت وجلالت کے خلاف سمجھ کر توبہ واستغفار سے کام لیا اور خداوند عالم کی طرف سے اسکے قبول کئے جانے کا مقصود یہ نہیں ہے کہ اس نے کسی معصیت سے درگذر فرمائی بلکہ آپ کے مراتب کا بڑھانا اور نبوت کا عظیم الشان منصب عطا فرمانا مراد ہے۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا ۚ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ (اور جب ہم نے (آدم کو) یہ حکم دیا تھا کہ یہاں سے اتر پڑو،

(تو یہ بھی کہہ دیا تھا کہ) اگر تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے (تو اسکی پیروی کرنا کیونکہ) جو لوگ میری ہدایت پر چلیں گے ان پر (قیامت میں) نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔ اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہی جہنمی ہیں۔ اور ہمیشہ دوزخ ہی میں پڑے رہیں گے۔

(۱) اس خطاب میں "اھبطوا" صیغہ جمع استعمال کئے جانے کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ بظاہر مخاطب فقط جناب آدم وحوا تھے لیکن ان کی ذریت کو بھی خطاب میں شامل کر لیا تھا۔ اور اس کے سمجھنے کے لئے یہ قرینہ کافی ہے کہ بعد میں بعضکم لبعض عدو فرما کر بنی آدم کی حالت بیان کی ہے اور درحقیقت اس خطاب میں صیغۂ جمع لانے کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ جنت سے اخراج کے ساتھ اس حالت کا بھی اظہار کر دیا جائے جو روئے زمین پر بنی آدم کی ہوگی۔ اور خطاب کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام مخاطبین حاضر ہوں۔ بلکہ جب کہ کسی عام بات کا کہنا مقصود ہوتا ہے تو دو یا ایک ہی کا حاضر ہونا کافی ہوتا ہے اور وہ عام بات خود اسکا قرینہ ہوتی ہے کہ خطاب بھی عام ہے اسکی مثال محاورۂ عام میں بکثرت ملتی ہے۔

(۲) سطور مندرجہ بالا سے ظاہر ہوا کہ بعضکم لبعض عدو کہنے سے فقط بنی آدم کی کیفیت ظاہر کی گئی ہے۔ نیز یہ کلام امر "اھبطوا" میں بحیثیت تتمہ حکم کے داخل نہیں ہے بلکہ حکم محض جنت سے ہبوط وخروج پر ختم ہو جاتا ہے۔ بعض میں اس حالت کا اظہار کیا گیا ہے جو کہ روئے زمین پر بنی آدم کی ہوگی پس یہ وہم کرنا محض قصور فہم ہے کہ جناب آدم وحوا میں عداوت کبھی نہیں ہوئی۔ پھر یہ کلام کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ اور باہم عداوت رکھنے کا حکم قبیح دینا خدا کے لئے کس طرح جائز تھا؟

(۳) "ہبوط" کے معنی محض مقام بلند سے پستی کیطرف آنے کے نہیں ہیں بلکہ اس سے کبھی عام نقل مکان بھی مراد ہوتی ہے۔ جس پر قرآن کی یہ آیت "اھبطوا مصراً" شاہد ہے۔

(۴) کبھی ایک ہی فعل کے لئے باعتبار اختلاف احوال کے صیغے مکرر لائے جاتے ہیں اذھب سالماً معافی اذھب مصاحباً" پس امر "اھبطو" میں بھی تکرار اسی لئے کی گئی ہے کہ مخاطبین کی دو حالتیں ہونے والی تھیں۔ ایک باہمی عداوت، دوسرے احکام شرعیہ کی اطاعت پر مکلف ہونا۔ لہٰذا پہلی بار اھبطو کہہ کر ان کی نسل کی باہمی عداوت کا ذکر فرمایا اور دوسری بار جملۂ اهْبِطُوْا جَمِیْعًا کہہ کر ہدایت وطاعت کے قبول وعدم قبول میں ان کے مختار ہونے کو بتایا ہے۔

(۵) "ھدی" سے وہ تمام ہدایات مراد ہیں جو خداوند عالم کیطرف سے انبیاء کے پاس بذریعہ وحی والہام نازل ہونے والی تھیں۔ اور وہاں سے تمام بنی آدم تک پہونچنے والی تھیں۔ اور ان کے نازل کئے جانے کا سبب بنی آدم کی وہی حالت تھی جسکا ذکر فقرۂ "بعضکم لبعض عدو" میں اجمالاً کیا گیا۔

يَٰبَنِيٓ إِسۡرَٰٓءِيلَ ٱذۡكُرُواْ نِعۡمَتِيَ ٱلَّتِيٓ أَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَأَوۡفُواْ بِعَهۡدِيٓ أُوفِ بِعَهۡدِكُمۡ وَإِيَّٰيَ فَٱرۡهَبُونِ ۝ ترجمہ (اے بنی اسرائیلی (یعقوب کی اولاد) میرے ان احسانات کو یاد کرو جو تم پر پہلے کر چکا ہوں اور تم میرے عہد و اقرار (ایمان) کو پورا کرو تو میں بھی تمہارے عہد (ثواب) کو پورا کروں گا۔ اور مجھی سے ڈرتے رہو۔)

عامۂ ناس کو مخاطب کر کے تمام نعمات عامہ کو بیان کر دینے کے بعد بنی اسرائیل سے خطاب کیا گیا۔ اور جو نعمتیں مخصوص ان کے اسلاف کو عطا کی گئی تھیں۔ انکا شمار شروع ہوا۔ اور جو کچھ ناشکری و اعمال ناشائستہ نسلاً بعد نسل وہ اسوقت تک کرتے آئے تھے۔ ان کو بیان کیا گیا۔ قبل اسکے کہ ان کی تفصیل شروع کیجائے یہ لکھدینا ضروری ہے کہ جتنے قصص وحکایات امم سابقہ کے قرآن مجید میں مذکور ہیں ان میں سے کچھ تو کتب سابقہ میں بھی موجود ہیں اگرچہ بعض کی تفصیلات میں بہت کچھ اختلاف و تغیر بھی پایا جاتا ہے۔ اور کچھ ایسے ہی جو ان میں ذکر نہیں کئے گئے ہیں۔ حقیقت قرآن کے منکرین دونوں صورتوں میں مخالفانہ دعوے کرتے ہیں۔ پہلی صورت میں تو یہ کہا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ تمام قصص وحکایات اپنے ان سفروں میں جو ملک شام کی طرف کئے تھے۔ علمائے اہل کتاب سے سنکر بیان کئے تھے۔ نیز ان کے بیان میں وہ باخبر افراد اہل کتاب بھی مدد دیتے تھے جو دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ اور دوسری صورت میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ تمام واقعات جعلی و اختراعی ہیں۔ ان کی کوئی اصلیت اصلی نہیں۔ کیونکہ عہد عتیق و جدید کی الہامی کتابیں ان کے ذکر سے خالی ہیں لیکن ہر بافہم سمجھ سکتا ہے کہ یہ دونوں دعوے متعدد وجوہ سے بالکل غلط ثابت ہوتے ہیں۔

(پہلی وجہ) محض ملک شام کی طرف سفر کرنا اس دعوی کے ثبوت کے لئے کافی نہیں ہو سکتا کہ آنحضرت علمائے یہود و نصاریٰ سے مل جل کر قصص وحکایات معلوم کیا کرتے تھے بلکہ اسکا تاریخی شہادت سے ثابت کرنا ضروری ہے اور یہ کسی طرح ممکن نہیں کیونکہ تمام سیر و تاریخ اس کے خلاف یہ شہادت دے رہی ہیں کہ آپ علمائے اہل کتاب کے تعارف سے احتیاط و احتراز کرتے تھے کیونکہ وہ آپ کے جانی دشمن تھے۔ رہا بعض اصحاب سے معلوم کرنے کا دعویٰ تو وہ پہلے دعویٰ سے بھی زیادہ ضعیف ہے۔ کیونکہ آپنے ان کے اسلام قبول کرنے سے بہت پہلے امم سابقہ کے قصص وحکایات کو بیان کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور درحقیقت اکثر اہل فہم کے اسلام قبول کرنے کا سبب بھی یہی ہوا تھا۔

(دوسری وجہ) اگر بعض باتوں کا کتب سابقہ کے مطابق ہونا اسکی دلیل ہو کہ انکا بیان الہامی نہیں

بلکہ اگلی کتابوں سے لیا گیا ہے تو تمام صحف عہد عتیق و جدید کا الہامی ہونا بھی کسی طرح ثابت نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جن انبیا کی طرف وہ منسوب کئے جاتے ہیں ان کی بابت بھی بعینہٖ یہی احتمال ہو سکتا ہے مثلاً جو واقعات گذشتہ زمانے کے کتاب تکوین و خروج میں بیان کئے گئے ہیں اگر ان واقعات کی بابت کوئی مخالف یہ کہے کہ جناب موسیٰ نے باخبر لوگوں سے سنکر بیان فرمائے تھے۔ الہام کو وہاں کوئی دخل نہیں تھا تو آخر اس کا جواب کیا دیا جائیگا۔ ؟ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو عہد عتیق و جدید میں بہ نسبت قرآن کے یہ احتمال زیادہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ انکا عنوان بیان و اسلوب کلام بھی ایسا نہیں جو ان کے الہامی ہونے کا ثبوت بن سکے۔

(تیسری وجہ) اگر قرآنی قصص وحکایات کا اگلی کتابوں سے بعض تفصیلات میں مختلف ہونا۔ یا ان میں بالکل مذکور نہ ہونا جعلی اور بے اصل ہونے کا ثبوت ہو تو خود ان کتابوں کی صحت بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ کیونکہ عہد عتیق کے واقعات وحکایات عہد جدید میں مذکور نہیں ہیں۔ اور خود ان کے بیان میں بھی شدید اختلاف موجود ہے۔

(چوتھی وجہ) عہد عتیق و جدید کے صحف میں اختلاف بیان کے علاوہ ایسی باتیں بھی مذکور ہیں جنکو صحیح قرار دینا ان انبیا کی نبوت ہی کو باطل کر دیتا ہے۔ جن کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ الہام کا ثبوت تو درکنار۔ مثال کے طور پر چند باتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

(۱) اور یعقوب اکیلا رہ گیا اور وہاں پو پھٹنے تک ایک شخص ان سے کشتی لڑا کیا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ اس پر غالب نہ ہوا تو اس کی ران کو بھیتر وار سے چھوا اور یعقوب کی ران کی نس اس کے ساتھ کشتی لڑنے میں چڑھ گئی۔ تب وہ بولا کہ مجھے جانے دے کہ پو پھٹتی ہے۔ وہ بولا کہ میں تجھے جانے نہ دونگا۔ مگر جبکہ تو مجھے برکت دیوے۔ تب اس نے اس سے پوچھا کہ تیرا نام کیا ہے وہ بولا کہ یعقوب۔ اس نے کہا کہ تیرا نام آگے کو یعقوب نہیں بلکہ اسرائیل ہوگا کہ تو نے خدا اور خلق پر قوت پائی۔ اور غالب ہوا۔"

(تکوین ۳۲-۲۴)

(۲) اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ پہاڑ سے اترنے میں دیری کرتا ہے تو وے ہارون کے پاس جمع ہوئے اور اس سے کہا کہ اٹھ ہمارے لئے معبود بنا کہ ہمارے آگے چلیں۔ کیونکہ یہ مرد موسیٰ جو ہمیں مصر کے ملک سے نکال لایا۔ ہم نہیں جانتے کہ اسے کیا ہوا۔ ہارون نے انھیں کہا کہ زیور سونے کے جو تمہاری جوروؤں اور تمہاری بیٹیوں اور بیٹوں کے کانوں میں ہیں توڑ توڑ کے میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ سب لوگ سونے کے زیور جو ان کے کانوں میں تھے۔ توڑ توڑ کے ہارون کے پاس لائے اور اس نے انکے ہاتھوں سے لیا اور ایک بچھڑا ڈھال کر اس کی صورت حکاکی کے ہتھیار سے درست کی۔ اور انھوں نے

کہا کہ اے اسرائیل یہ تمہارا معبود ہے (خروج ۳۲ - ۱ - ۶)

(۳) پھر پیالہ لیکر شکر کیا - اور انھیں دیکر کہا کہ تم سب اس میں سے پیو - کیونکہ یہ میرا لہو ہے یعنی نئے عہد کا لہو جو بہتوں کے گناہوں کی معافی کے لئے بہایا جاتا ہے - میں تم سے کہتا ہوں کہ انگور کے پھل کا رس پھر نہ پیوں گا - اس دن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہت میں نیا نہ پیوں -"

(متی ۲۶ - ۲۷ - ۳۰)

مندرجہ بالا امور میں جو باتیں درج ہیں کیا وہ کسی نبی کی ہو سکتی ہیں؟ ہرگز نہیں - پھر قرآن اسکی تتبع کس طرح کر سکتا تھا -؟

بالجملہ قرآن مجید بیان قصص وحکایات میں کتب سابقہ کا تابع نہیں اور نہ تصدیق میں انکا محتاج ہے بلکہ حقیقت امر تو یہ ہے کہ وہ خود اپنی تصحیح وتصدیق میں قرآن کی پوری احتیاج رکھتی ہیں - اگر اس کے بیان کئے واقعات حق وباطل، صدق وکذب کو ممتاز نہ کر دیتے تو محض اگلی کتابوں کے بیان سے کسی واقعہ کی صحت کا معلوم ہونا تو درکنار، انبیاء ورسل کی نبوت ورسالت کا ثابت ہونا بھی دشوار ہوتا -

عہد عتیق کی چند بشارتیں

اس تمہید کے بعد ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آیہ مبحوث عنہا میں وہی عہد وپیمان مراد ہیں جو بنی اسرائیل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق واطاعت کے متعلق جناب موسیٰ اور دیگر انبیاء کے عہد میں لئے گئے تھے اس کے ثبوت کے لئے عہد عتیق سے چند بشارتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں - عہد جدید کی بشارتوں کا ذکر آئندہ کیا جائیگا -

(پہلی بشارت) اور اسمٰعیل کے حق میں میں نے تیری سنی - دیکھ میں اسے برکت دوں گا - اور اسے برومند کروں گا - اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے - اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا -

(التکوین ۱۷ - ۲۰)

اس بشارت میں جناب ابراہیم کی جس درخواست کا قبول کرنا مذکور ہے - وہ قرآن مجید کی اس آیت میں بیان کی گئی ہے -

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَ اِسْمٰعِیْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۝ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا

اور (وہ وقت بھی یاد دلاؤ) جب ابراہیم واسماعیل خانہ کعبہ کی بنیادیں بلند کر رہے تھے - (اور دعا مانگتے جاتے تھے کہ) اے ہمارے پروردگار ہماری یہ خدمت قبول فرما - بیشک تو ہی (دعا کا) سننے والا (اور نیت کا) جاننے والا ہے - اے ہمارے پالنے والے تو ہمیں اپنا

مِنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ

فرمانبردار بندہ بنا - اور ہماری اولاد سے ایک گروہ (پیدا کر) جو تیرا فرمانبردار ہو - اور ہم کو ہمارے عبادات کے مقامات دکھا دے اور ہماری توبہ قبول کر بیشک تو ہی بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے - (اور) اے ہمارے پالنے والے نسل والوں میں انھیں میں سے ایک رسول کو بھیج جو انکو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور آسمانی کتاب اور عقل کی باتیں سکھائے اور ان (کے نفوس) کو پاکیزہ کر دے - بیشک تو ہی غالب اور صاحب تدبیر ہے -

اگر تسلیم نہ کیا جائے کہ وہ دعا یہی تھی جو اس آیت میں مذکور ہے تو بتانا چاہیئے کہ اسماعیل کے حق میں جناب ابراہیم نے اسکے سوا اور کون سی دعا کی تھی اور اس کا قبول ہونا کب اور کیونکر ظاہر ہوا -؟

نیز اس بشارت سے معلوم ہوا کہ خداوند عالم نے جناب اسمٰعیل کی نسل سے بارہ سرداروں کو پیدا کرنے کا وعدہ فرمایا تھا جن سے عام سلاطین جور وظلم مراد نہیں ہو سکتے - اس لئے کہ ان کی سلطنت اس قابل نہ تھی کہ خلیل خدا اس کی درخواست کرتے - اور بارگاہ الٰہی سے تعظیم وتکریم کے ساتھ اسکی بشارت دیجاتی - علاوہ اس کے نسل اسماعیل میں بارہ سے کہیں زیادہ سلاطین جور پیدا ہوئے - پس یہ مخصوص تعداد بارہ کی ان کے اعتبار سے مطابق واقع نہیں ٹھہرتی - لہٰذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان سرداروں سے وہی لوگ مراد تھے جن کی ریاست وسرداری دینی تھی - اور بغرض ہدایت خلق دنیا میں پیدا کئے جانے والے تھے - اور دینی ریاست نبوت وخلافت نبی کے سوا اور کوئی ریاست نہیں ہو سکتی - چونکہ یہ معلوم ہے کہ ذریت اسماعیل میں بارہ انبیاء نہیں پیدا ہوئے - لہٰذا ان سے خلافت نبی لامحالہ مراد ہو گی - پس ثابت ہوا کہ بشارت کا مذکورہ تعلق جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ آپ کے ان بارہ خلفاء واوصیاء سے بھی ہے جن کی امامت وریاست سراسر دینی تھی - ظلم وجور کا اسمیں دخل نہ تھا -

(دوسری بشارت) خدا تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے، تیرے ہی بھائیوں میں سے میرے مانند ایک نبی برپا کرے گا - تم اسکی طرف کان دھریو (استثنا ۱۸ - ۱۵)

"اور خداوند نے مجھے کہا کہ انھوں نے جو کچھ کہا سو اچھا کہا میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سے ایک نبی کروں گا - اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا - اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب انسے کہے گا - اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنھیں وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا - تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا -"

(استثنا ۱۸ - ۱۷ - ۱۹)

ان آیتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی ایسی صاف وصریح بشارت ہے

جس سے انکار کرنا آفتاب پر خاک ڈالنا ہے۔ خدا نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے ایک نبی مبعوث کریگا۔ جو موسیٰ کے مثل ہوگا اور کچھ شبہ نہیں کہ بنی اسرائیل کے بھائی بنی اسماعیل ہیں اور بنی اسماعیل میں بجز محمد مصطفےٰ صلی علیہ وآلہ وسلم کے اور کوئی نبی نہیں ہوا۔

علاوہ اس کے آیت مذکورہ کی لفظیں صاف طور سے بتا رہی ہیں کہ یہ بشارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ہے۔ اول یہ کہ "اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا" دوم یہ کہ "میرے مانند تجھ سا"۔ ان تمام لفظوں کا مصداق سوائے پیغمبر اسلام کے اور کوئی نہیں ہے۔

یہود و نصاریٰ دونوں اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ انبیاء بنی اسرائیل پر سوائے احکام عشرہ موسیٰ کے جتنی وحی آئی۔ اس کے الفاظ وہی نہیں ہیں جو توریت اور زبور و صحف انبیاء میں لکھے ہوئے ہیں بلکہ انبیاء پر مطالب القا ہوتے تھے جن کو وہ اپنی زبان میں لوگوں سے بیان کرتے تھے۔ اناجیل اربعہ جو معتبر تسلیم کی جاتی ہیں ان کے الفاظ کا تو حضرت عیسیٰ کی زبان مبارک سے نکلا ہوا ہونا تسلیم ہی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ کی زبان عبرانی تھی اور وہ انجیلیں یونانی میں لکھی گئی ہیں۔ ہاں قرآن ہی البتہ ایسا کلام ہے جسکے الفاظ پیغمبر کے منہ میں رکھے گئے اور وہی لفظیں پیغمبر نے لوگوں کو پڑھ کے سنائیں پس یہ الفاظ بشارت۔ اپنا کلام اسکے منہ میں ڈالوں گا۔ سوائے محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور کسی پر صادق نہیں آسکتے۔

رہی دوسری بات کہ حضرت موسیٰ کے مثل کون سا پیغمبر مبعوث ہوا تو بنی اسرائیل میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں ہوا جو مثل موسیٰ علیہ السلام رہا ہو۔ کیونکہ حضرت عزیر نبی نے جب قید بابل کے بعد تحریر فرمایا تو اس میں یہ بھی تصریحاً لکھا ہے۔ "اور پھر قائم نہ ہوا کوئی نبی بنی اسرائیل میں موسیٰ کے مانند" پس اس لفظ "میرے مانند" اور تجھ سا کا مصداق بجز پیغمبر اسلام کے اور کوئی دوسرا نبی نہیں ہوسکتا۔

مندرجہ ذیل باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ہی وہ پیغمبر تھے۔ جس میں حضرت موسیٰ سے مشابہت پائی جاتی تھی۔

(۱) حضرت موسیٰ نے اپنے دشمنوں کے خوف سے اپنے وطن سے ہجرت کی۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اپنے وطن مکہ سے دشمنوں کے خوف سے ہجرت کرنی پڑی۔

(۲) حضرت موسیٰ نے بھی ہجرت کرکے شہر یثرب میں پناہ لی جسکو اب مدینہ کہتے ہیں۔ اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی مکہ سے ہجرت کرکے اسی شہر میں قیام کیا۔

(۳) حضرت موسیٰ پر خدا کا کلام بلفظہ نازل ہوا جو احکام عشرہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح آنحضرت پر بھی خدا

کا کلام بلفظہ نازل ہوا جو اب بھی موجود ہے۔

(۴) حضرت موسیٰ کو کافروں کے ساتھ جہاد کرنے کا حکم ہوا اور اسکا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دیا گیا۔

(۵) حضرت موسیٰ نے اپنی متفرق اور پامال قوم کو مصر سے نکال کر یکجا مجتمع کر دیا اور حضرت خاتم النبین نے بھی تمام متفرق قبائل عرب کو جو آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے باہم شیر و شکر کیطرح ملا دیا۔

(۶) حضرت موسیٰ نے ملک فتح کئے اور بنی اسرائیل میں سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ ایسا ہی آنحضرتؐ نے بھی کیا۔

(۷) حضرت موسیٰ کو شریعت عطا ہوئی۔ اور ایک کتاب دی گئی۔ اور آنحضرتؐ کو بھی شریعت اور کتاب عطا کی گئی۔

(۸) حضرت موسیٰ کے بعد امت متعدد فرقوں میں متفرق ہوئی۔ ایسا ہی آنحضرت کے بعد بھی واقع ہوا ان کے علاوہ اور بھی وجوہ مشابہت پائی جاتی ہیں جنکو بخوف تطویل ذکر نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجوہ مذکورہ اسکے ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ حضرت موسیٰ نے یہ بشارت خدا کیطرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت بنی اسرائیل کو دی تھی۔ اور ان سے آپ کی تصدیق و اطاعت کا عہد لیا تھا۔ اور بتا دیا تھا کہ اگر اسکے خلاف کرینگے۔ تو ان سے باز پرس کی جائیگی۔ پس آیہ مبحوث عنہا کے جملہ "اوفوا بعهدی" نے اسی عہد کیطرف متوجہ کیا ہے۔ اور اس کے پورا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے حکم سے پہلے وہ نعمتیں یاد دلائیں جو ان کے اسلاف کو عطا کی تھیں۔ مثلاً فرعون کے ظلم سے خدا کا بنی اسرائیل کو نجات دینا۔ اور سلطنت دنیا عطا کرنا۔ من و سلویٰ کا نازل فرمانا وغیرہ وغیرہ۔

وَآمِنُوا بِمَا أَنزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ ۖ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ ○ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ○ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ○

ترجمہ:۔ اور جو (قرآن) میں نے نازل کیا وہ اس (کتاب توریت) کی بھی تصدیق کرتا ہے جو تمہارے پاس ہے۔ اور تم سب سے پہلے اسکے انکار پر موجود نہ ہو جاؤ۔ اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑی قیمت (دنیوی فائدہ) نہ لو۔ اور مجھی سے ڈرتے رہو۔ اور حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ۔ اور حق بات کو نہ چھپاؤ۔ حالانکہ تم جانتے ہو اور پابندی سے نماز ادا کرو۔ اور زکوٰۃ دیا کرو۔ اور جو لوگ ہمارے سامنے عبادت کے لئے جھکتے ہیں ان کے ساتھ تم بھی جھکا کرو۔

maablib.org

(۱) اُن آیات سے جن میں قرآن کو توریت و انجیل کا تصدیق کرنے والا بتایا گیا ہے۔ اُن کتابوں کے منسوخ نہ ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ نافہمی ہے کیونکہ قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان کتب موجودہ میں حسب منشاء تحریف و تبدیلی کر دی گئی ہے نیز ان کے بعض مضامین کا انکار بلیغ کیا گیا ہے۔ مثلاً تثلیث و ربوبیت عیسیٰؑ وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح بہت سے احکام میں بھی صریح اختلاف موجود ہے جنکا شمار اس مقام پر ضروری نہیں۔ پس یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید کتب سابقہ کی تمام باتوں کی تصدیق کرتا ہے۔ لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ جن آیتوں میں قرآن کا مصدق کتب سابقہ ہونا مذکور ہے۔ ان میں تمام باتوں کی تصدیق مراد نہیں ہے بلکہ فقط کچھ باتوں کی تصدیق مراد ہے۔ لیکن اس سے کتب سابقہ کا منسوخ نہ ہونا ثابت نہیں ہو سکتا۔ قرآن اور کتب سابقہ کا اتفاق یا تو بعض قصص و حکایات میں ہے۔ یا ان امور میں جو اصول دیانت ہیں۔ مثلاً عبادت خالق و امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا واجب ہونا۔ اور ظلم و کذب کا حرام ہونا اور ایسے ہی وہ تمام امور جن کا حسن و قبح عقلی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ امور کسی وقت میں قابل نسخ نہیں ہو سکتے۔ رہے احکام جزئیہ و کیفیات عبادات تو ان کے معاملہ میں قرآن کتب سابقہ سے بہت کچھ اختلاف رکھتا ہے جس سے انکا منسوخ ہو جانا بخوبی ثابت ہوتا ہے

(۲) اس آیت میں پیغمبر اسلام کے مبعوث ہونے کی بشارت اور آپکے اتباع و اطاعت کے اسی عہد و پیمان کی تصدیق مراد ہے جسکو ہم نے پہلے توریت سے نقل کیا اور "مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ" کہنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر اہل کتاب اپنی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں تو انکو قرآن پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ کیونکہ وہ اسی بات کو بیان کرتا ہے جو ان کتابوں میں بھی مذکور ہیں لہٰذا اسکا انکار کر کے ان کتابوں پر ایمان لانا ممکن نہیں۔

(۳) حی بن اخطب و کعب بن الاشرف اور دیگر رؤسائے یہود کو یہ خوف تھا کہ اگر وہ آنحضرتؐ کی پیروی کریں گے۔ تو جتنے وظائف و تحائف انکو عوام سے ملتے ہیں بند ہو جائیں گے۔ لہٰذا جو آیتیں پیغمبر اسلام کی شان میں تھیں۔ ان میں تحریف کرتے تھے۔ یا خواہ مخواہ بیجا تاویلیں کر کے عوام الناس کو فریب دیتے تھے۔ پس یہ آیت انھیں کی تنبیہ کے لئے نازل کی گئی۔

(۴) وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا۔ کہنے سے خدا کا یہ مقصود نہیں ہے کہ میری آیتوں کو کم قیمت پر نہ بیچو۔ ہاں اگر زیادہ یا برابر قیمت ملے تو فروخت کر دو۔ بلکہ اسکا مطلب یہ ہے کہ تم میری آیتوں کو جس قیمت پر بیچو گے وہ درحقیقت بہت کم ہوگی۔ خدا کی نازل کی ہوئی آیتوں کا عوض دنیائے فانی کا مال و متاع نہیں ہو سکتا ـــــــــــــــــــــــــــــــ

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُمْ وَأَنتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ترجمہ:۔ (تم اور لوگوں سے تو نیکی کرنے کو کہتے ہو اور اپنی خبر نہیں لیتے۔ حالانکہ تم کتاب خدا کو برابر رٹا کرتے ہو۔ تو کیا تم (اتنا بھی نہیں سمجھتے")

علماء یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ ایک رسول عنقریب مبعوث ہوگا۔ لہٰذا تم اس کی پیروی کرنا۔ لیکن جب رسولخدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو آپ کی تکذیب و مخالفت پر آمادہ ہو گئے۔ اس پر ملامت کرنے کے لئے خدا نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ۚ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ۝

ترجمہ:۔ (اور مصیبت کے وقت صبر اور نماز کا سہارا پکڑو۔ اور یقیناً (یہ) نماز دوبھر ہے، مگر ان خاکساردل پر نہیں۔)

(۱) صبر سے مراد روزہ ہے۔ چونکہ روزہ میں کھانے اور پینے اور دیگر نفسانی خواہشوں کے ترک پر صبر کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے اسکو "صبر" سے تعبیر کیا۔

(۲) اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کو تصفیہ باطن۔ تزکیۂ روح اور تکمیل ایمان میں بدنی عبادت اور جسمانی ریاضت سے مدد لینی چاہیئے۔ اسکے بغیر نہ جان و مال میں طہارت آ سکتی ہے۔ اور نہ ایمان مکمل ہو سکتا ہے۔ جو لوگ دنیا کو یہ بتاتے ہیں کہ نجات صرف ایمان سے وابستہ ہے۔ اعمال کو اس میں کچھ دخل نہیں۔ انکا کلام اس شخص کے قول سے زیادہ باوقعت نہیں ہے۔ جو یہ کہتا ہے کہ گھر کا روشن ہونا محض چراغ یا بجلی کے نور پر موقوف ہے۔ نہ کہ فتیلہ و روغن اور بجلی کے انجن کی حرکت پر۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ محض روح کی طہارت اور ایمان کا کمال باعثِ نجات اخروی ہے۔ مگر یہ بھی تو بتانا چاہیئے کہ یہ کمالات بجز عبادات بدنیہ و ریاضتِ جسمانیہ کے اور کسی وسیلہ سے حاصل نہیں ہو سکتے ہیں کیا محض تعیش اور حیوانوں کی طرح مطلق العنان رہنے سے بھی تصفیۂ باطن و تکمیلِ ایمان ممکن ہے؟ اگر عقل کو عیش پسندی اور جذبات حیوانی سے کچھ بھی رہا ہونے کا موقع دیا جائے تو وہ اس سوال کا جواب یقیناً نفی کی صورت میں دے گی۔

علاوہ اس کے کوئی عقلمند اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ کہ منعم کی شکر گزاری اور اسکے حقوق نعمت کو ادا کرنا واجب ہے۔ اور اسکی صورت بجز اسکے اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ ہر ممکن طریق سے اسکی اطاعت اور خدمت بجا لائے چاہے محض زبانی اقرار سے پورا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ پس منعم حقیقی کی نعمات غیر متناہیہ کا شکر کامل طور سے بجز طاعات و عبادات کے اور کس صورت سے ادا کیا جا سکتا ہے۔۔۔؟

(۳) "خاشعین" سے وہ لوگ مراد ہیں جو انکساری کی عادت اور دل میں ایمان اور خدا کا

خوف رکھتے ہیں چونکہ یہ لوگ عبادات کے نفع و ثواب کا یقین رکھتے ہیں اس لئے انکے دلوں پر گراں نہیں گزرتیں۔ بلکہ پوری نوعیت سے بجالاتے ہیں۔ برخلاف اس کے جو لوگ ایمان اور خوفِ خدا سے واسطہ نہیں رکھتے ان پر نہایت شاق ہوتی ہیں۔ کیونکہ انکا کوئی ثمرہ ایسے لوگوں کو نظر نہیں آتا۔

اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ ترجمہ (جو بخوبی جانتے ہیں کہ وہ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے اور ضرور اسکی طرف لوٹ کر جائینگے۔)

(۱) اس آیت میں "ظن" بمعنی "علم و یقین" ہے۔ اور اسکی مثال کلامِ عرب میں بکثرت ملتی ہے۔ چنانچہ درید بن الصمہ کہتا ہے ؎

نقلت لهم ظنوا بالفی مدجج　　سراتهم فی الفارسی المسرد

(۲) ملاقوا ربھم کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ خداوندعالم کو آنکھوں سے دیکھیں گے۔ کیونکہ ملاقات کی لفظ محاورہ عام میں ایسی چیزوں کے لئے بھی بولی جاتی ہے جو قابلِ رویت نہیں ہوتیں۔ مثلاً "لقی فلان جهداً شدیداً" بولتے ہیں حالانکہ تعب و مشقت کوئی مرئی شے نہیں پس معلوم ہوا کہ ملاقات رویت سے عام ہے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ ترجمہ اے بنی اسرائیل میری ان نعمتوں کو یاد کرو جو میں تمہیں دے چکا ہوں اور میں نے تم کو سارے جہان کے لوگوں سے بڑھا دیا۔

اس آیت سے اس امر پر استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ کہ بنی اسرائیل کو سارے اہلِ عالم پر خواہ کسی زمانہ میں ہوں فضیلت دی گئی تھی۔ لہٰذا وہ پیغمبر اسلام اور آپ کی امت مسلمہ سے بھی افضل تھے۔ کیونکہ پروردگار عالم نے دوسرے مقام پر مومنین امت محمدیہ کی بابت فرمایا ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس (تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے ظاہر کئے گئے) جس سے ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو تمام اگلی امتوں پر فضیلت دی گئی ہے۔ اگر بنی اسرائیل کو بدونِ تخصیص زمانہ تمام اہلِ عالم سے افضل قرار دینا مقصود ہوتا تو مومنین امت محمدیہ کی بابت ایسا نہ فرماتا۔ لہٰذا جن جن آیتوں میں بنی اسرائیل کو اہلِ عالم پر فضیلت دینا مذکور ہے اُن سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ اپنے عہد کے تمام لوگوں سے افضل قرار دیے گئے تھے اور بس۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔـا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّ

لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ ترجمہ:- اور اس دن سے ڈرو (جس دن) کوئی شخص کسی کی طرف سے فدیہ نہ ہوسکے گا۔ اور نہ اسکی طرف سے کوئی سفارش مانی جائیگی۔ اور نہ اسکا کوئی معاوضہ لیا جائے گا۔ اور نہ وہ مدد پہونچائے جائیں گے۔

عقیدۂ فدیہ کا ابطال یہ آیت مسیحیوں کے خطرناک عقیدۂ فدیہ کو باطل قرار دیتی ہے۔ اور صاف لفظوں میں بتارہی ہے کہ کوئی شخص دوسرے کا عوض و فدیہ نہیں ہوسکتا۔ بلکہ جو شخص اپنے اعمال کیوجہ سے جس سزا کا مستحق ہوگا وہ اسی کو دی جائے گی۔ اس سے زیادہ مہلک اور کوئی اعتقاد نہیں ہوسکتا کہ کسی معتقد کو اپنے اعمالِ بد کا فدیہ سمجھ کر اپنے نفوس کو تمام فرائض و محرمات میں قیودِ شرعیہ سے ہر طرح آزاد کرلیا جائے ناظرین کی عبرت کے لئے عقیدۂ فدیہ کے بطلان کی چند وجہیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

انجیلوں کی تعلیمات کی بنا پر دنیا کو بتایا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ قدوس و عادل ہے۔ گناہوں سے نفرت و کراہت کرتا ہے۔ پس اسکا قدس و عدل یہ لازم قرار دیتا ہے کہ بندوں کو انکی خطاؤں کی سزا دی جائے۔ وہ قدوس و عادل ہونے کے سبب کسی خطاکار کے گناہوں سے چشم پوشی کرکے قصاص و انتقام ترک نہیں کرسکتا۔ اور وہ سزا و عقاب یہی ہے کہ جہنم کی آگ اور موت ابدی میں مبتلا کردیگا۔ لہٰذا کلمۂ الٰہیہ کو مجسم کرکے دنیا میں بھیجا اور وہ اُن سزاؤں کا متحمل ہوا جس کے خطاکار بندے مستحق تھے اور فدیہ بننے کیلئے مخصوص کلمۂ الٰہیہ کو بشری قالب میں بھیجنے کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ فدیہ کو طاہر و مقدس ہونا چاہیئے تاکہ وہ عدل الٰہی کے حق کو پورا کرسکے۔

یہ عقیدۂ فدیہ کا خلاصہ ہے جو انجیلوں اور دیگر کتب نصاریٰ میں شرح و بسط سے مرقوم ہے لیکن اہل بصیرت کو اس میں متعدد وجوہ خلل و فساد نظر آتے ہیں۔

(پہلی وجہ) بے شک خداوندعالم قدوس و عادل ہے مگر اس کا قدس و عدل اسکو گناہگاروں سے انتقام لینے پر مجبور نہیں کرتا۔ بلکہ رحم و عفو و مغفرت کا اختیار بھی اسکو حاصل ہے۔ اگر اسکا اعتقاد نہ رکھا جائے تو کتب مقدسہ کی حقیقت سے دست بردار ہونا پڑیگا۔ کیونکہ ان میں بے شمار مواقع پر ان صفات کا اظہار کیا گیا ہے۔

(دوسری وجہ) ایک بندہ کے گناہوں کا عقاب دوسرے پر ڈالنا عدل نہیں بلکہ سراسر ظلم و جور ہے چہ جائیکہ سارے عالم کے بیشمار گناہوں کا بارگراں کسی ایسے بندہ پر ڈالنا جو صالح و معصوم ہو۔

(تیسری وجہ) جبکہ اقرار کیا جاتا ہے کہ گناہوں کی سزا آتشِ جہنم اور موت ابدی ہے تو آخر اس عقاب جہنم اور موت ابدی کا عوض چند روز کی موت اور چند ساعت کی جسمانی مشقت کیونکر بن سکتی ہے

اور اس سے عدل الٰہی کا واجب حق کب پورا ہو سکتا ہے۔؟ لا محالہ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ خدائے قدوس وعادل نے حضرت مسیح کی چند روزہ موت اور وقتی درد والم کو بندوں کے عقاب ابدی کے عوض میں قبول کر کے عدل کے خلاف کیا۔

(چوتھی وجہ) اس میں شبہ نہیں کہ ذات الٰہی قدوس ہے اور گناہوں سے کراہت رکھتی ہے لیکن فی الواقع اسکا تقاضا یہ ہونا چاہیئے کہ معصیت کی سزا خود گناہگار کو دی جائے تاکہ اسکے خوف سے وہ گناہ کی جرأت ہی نہ کر سکے۔ کسی کو عوض وفدیہ قرار دینا دوسروں کو معصیت کی ترغیب دینا۔ اور مواخذہ وعقاب سے بے خوف کر دینا ہے۔

(پانچویں وجہ) انجیلوں میں جناب عیسیٰ کی بابت متعدد مقام پر لکھا ہے کہ آپ صلیب کے خوف سے دلگیر وغمگین ہو رہے تھے اور نہایت اضطراب کے ساتھ خداوند عالم کی جناب میں درخواست کر رہے تھے کہ اگر ہو سکے تو یہ گھڑی مجھ سے ٹل جائے (دیکھو مرقس ۱۴۔ ۳۵۔ ۳۶ متی ۲۶۔ ۳۶۔ ۳۸۔ ۳۹۔)

اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے برضا ورغبت گناہگاروں کا فدیہ بننا گوارہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ خداوند عالم نے دوسروں کے گناہوں کا قصاص آپ سے بجبر لیا۔ پھر اس سے زیادہ ظلم صریح اور کیا ہو سکتا ہے۔

(چھٹی وجہ) جناب عیسیٰ کی بابت مختلف ومتضاد اقوال دنیا کو سنائے جاتے ہیں۔ کبھی آدم کہا جاتا ہے کبھی ابن اللہ۔ اور کبھی عینِ خدا۔ اگر تیسری صورت صحیح ہے تو عقیدہ فدیہ کا محصل یہ ہوا کہ خود خداوند عالم نے اس عقاب ابدی کا بار اٹھایا۔ جس کے گناہگار بندے مستحق تھے اور چند روز موت خود اس پر طاری رہی۔ اس سے بڑھ کر کلمہ کفر اور بھی ہو سکتا ہے۔؟

(ساتویں وجہ) عالم میں شرائع کو جاری کرنے اور مخالفت اوامر ونواہی پر بندوں کو سزا دینے سے پروردگار عالم کا مقصود یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی ذاتی غرض وغایت کو پورا کرے تاکہ یہ کہا جا سکے کہ جب کسی عبد صالح نے شریعت کی پابندی کا پورا حق ادا کر کے اور تمام عقوبات کا بار اٹھا کے اس غرض الٰہی کو پورا کر دیا تو اب اسکی ضرورت باقی نہ رہی کہ دوسرے بندوں کو قیود شریعت میں گرفتار رکھا جائے۔ اور نافرمانی کی سزا دیجائے بلکہ تشریع شرائع کی غایت یہ ہے کہ ہر فرد بشر کی اخلاقی وتمدنی حالت کی اصلاح کی جائے تاکہ سب اس کی پابندی کر کے سعادت دارین حاصل کر سکیں۔ پس پولس کی یہ تعلیم کہ جب ایمان آچکا تو پھر ہم کسی مودب کے تحت میں نہیں رہے"۔ سراسر مصلحتِ الٰہی کے خلاف اور نہایت مہلک ہے۔

بالجملہ عقیدہ فدیہ سے زیادہ دینی تباہی کا باعث اور کوئی اعتقاد نہیں ہو سکتا۔ مزید اطمینان کے لئے ناظرین پولوس کے اس کلام "مسیح نے ہمیں مول لیکر شریعت کی لعنت سے چھوڑایا کہ وہ ہمارے بدلہ میں

لعنت ہوا۔ کیونکہ لکھا ہے کہ جو کوئی کاٹھ پر لٹکایا گیا سو لعنتی ہے" پر نظرِ عبرت ڈالیں اور پھر انصاف سے بتائیں کہ اپنے نبی بلکہ خدا کو ملعون بنانے کے بعد بھی اس امت کے باایمان ہونے کا احتمال ہو سکتا ہے۔؟

لَا یُقبَل منہا شفاعۃ فرمانے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ کفار جن لوگوں کو اپنا شفیع بنا کر لائینگے انکی شفاعت قبول نہیں کی جائے گی اسکے علاوہ متعدد آیتوں میں صاف طور سے بتایا گیا ہے کہ کافروں کے لئے کوئی شفاعت کرنے والا نہ ہوگا۔ نیز کئی آیتوں میں تصریحاً بتا دیا ہے کہ کچھ لوگوں کو شفاعت کی اجازت دی جائے گی منجملہ ان کے ایک یہ آیت ہے من ذالذی یشفع عندہ الا باذنہ لہٰذا جہاں جہاں شفاعت کی نفی کی گئی ہے وہاں نفی عام مراد نہیں ہے بلکہ وہ کفار کے حق میں اور ان لوگوں کی بابت وارد ہوئی ہے جنکو شفاعت کی اجازت عطا نہ ہوگی۔

وَاِذْ نَجَّیْنٰکُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَکُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَکُمْ وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ ۝

ترجمہ:۔ (اور اس وقت کو یاد کرو کہ ہم نے تمکو آل فرعون (کے مظالم) سے نجات دی جو تمہیں بڑے دکھ دیکر ستاتے تھے۔ تمہارے لڑکوں کو ذبح کر دیتے تھے۔ اور تمہاری لڑکیوں کو (اپنی خدمت کیلئے) زندہ رہنے دیتے تھے۔ اور اس (نجات بخشی) میں تمہارے رب کیطرف سے بڑی نعمت تھی)

(۱) لفظ آل اور اہل میں فرق یہ ہے کہ آل خاص اور اہل عام ہے۔ مثلاً اہل بصرہ اور اہل کوفہ کہنا صحیح ہے مگر آل بصرہ وآل کوفہ کہنا غلط ہے۔ اور جب آل کسی شخص خاص کیطرف مضاف ہوتا ہے تو اس کے مخصوص اہلبیت مراد ہوتے ہیں۔ اسکی تفصیل آئندہ آئے گی۔

(۲) فرعون عمالقہ کا لقب تھا جیسے سلاطین روم کا لقب قیصر تھا۔ عہد جناب موسیٰ میں جو فرعون تھا اس کا نام مصعب بن ریان یا ولید بن مصعب تھا۔

(۳) بلاء کے اصل معنیٰ امتحان واختبار ہیں۔ لیکن یہ احسان اور نعمت کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ آیت زیر بحث میں دونوں احتمال ہیں۔ صاحب تفسیر "صافی" نے مراد "نعمت" لیا ہے جیسا کہ ترجمہ میں تحریر کیا گیا ہے۔

وَاِذْ فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنٰکُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ

(اور وہ وقت بھی یاد کرو جب ہم نے دریا کو تمہارے لئے شگافتہ کر دیا۔ اور ہم نے تمکو بچا لیا۔ اور فرعونیوں کو تمہارے دیکھتے دیکھتے غرق کر دیا۔)

حضرت موسیٰ قریب صبح بنی اسرائیل کو لیکر مصر سے نکلے تھے کہ فرعون کو خبر ہوئی اور اس نے اپنی فوج

کیسا تھا ان کا تعاقب کیا اور ایک ایسے مقام پر پالیا۔ کہ سامنے دریا تھا۔ اور کشتیاں بھی موجود نہ تھیں کہ ان کے ذریعے سے اتر جائیں اس نازک وقت میں جناب موسیٰ کو حکم الٰہی ہوا کہ اپنے عصا کو دریا کے پانی پر مارو۔ اسکی تعمیل کرتے ہی دریا کا پانی پھٹ گیا اور خشک راستہ مل گیا۔ جب بنی اسرائیل اس میں سے گذر گئے تو فرعون نے پیچھا کیا مگر ابھی دریا کے وسط میں پہونچا تھا کہ پانی مل کر ایک ہوگیا اور فرعون مع تمام فوج کے غرق ہو گیا۔ جو لوگ خداوند عالم کی قدرت کاملہ پر ایمان رکھتے ہیں ان کے نزدیک عصا کے مارنے سے پانی کا پھٹ جانا اور خشک راستہ مل جانا کسی تاویل کا محتاج نہیں جو لوگ اس واقعہ کی تاویل بعید کرتے ہیں وہ درحقیقت خدا کی قدرت پر ایمان نہیں رکھتے۔

وَإِذْ وَاعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ۝ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝

ترجمہ:۔ اور وہ وقت بھی یاد کرو جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا تھا اور تم لوگوں نے ان کے جانے کے بعد ایک بچھڑے کو (پرستش کیلئے خدا) بنا لیا حالانکہ تم اپنے اوپر ظلم ڈھا رہے تھے۔ پھر ہم نے اسکے بعد بھی درگذر کی تاکہ تم شکر کرو۔)

اس واقعہ کا تفصیلی ذکر آئندہ آئے گا۔

وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝ ترجمہ:۔
اور اسوقت کو بھی یاد کرو جب موسیٰ کو کتاب (توریت) عطا کی اور حق و باطل کو جدا کرنیوالا قانون (عنایت کیا) تاکہ تم ہدایت پاؤ۔)

"فرقان" ہر اس شے کو کہتے ہیں جو دو چیزوں میں فرق ظاہر کر دینے والی ہو اس لئے قرآن مجید کو فرقان کہا گیا ہے کیونکہ وہ حق و باطل کو ممتاز کرنے والا ہے۔ نیز جنگ بدر کا دن بھی فرقان کہا جاتا ہے اس لئے کہ اس دن حق و باطل میں فرق نمایاں ہو گیا تھا۔ اس آیت میں "فرقان" سے وہ آیات و معجزات مراد ہیں جو جناب موسیٰؑ کو دیئے گئے تھے۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ ترجمہ:۔ (اور وہ وقت بھی یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم تم نے بچھڑے کو (خدا) بنا کے اپنے اوپر سخت ظلم کیا (اسکے سوا اب کوئی علاج نہیں کہ) تم اپنے خالق کی بارگاہ میں توبہ کرو اور وہ یہ ہے

کہ اپنے کو قتل کر ڈالو۔ تمہارے پروردگار کے نزدیک تمہارے حق میں بہتر یہی ہے (جب تم نے ایسا کیا تو) خدا نے تمہاری توبہ قبول کر لی۔ بیشک وہ بڑا معاف کرنے والا مہربان ہے)

یہ آیت بھی جناب موسیٰ کی غیبت میں بچھڑے کی پرستش اور اسکی سزا سے تعلق رکھتی ہے جسکا تفصیلی ذکر آئندہ آرہا ہے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ۝ ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ

ترجمہ:۔ (اور وہ وقت بھی یاد کرو) جب تم نے موسیٰ سے کہا تھا کہ اے موسیٰ ہم تو تم پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک ہم خدا کو ظاہر بظاہر نہ دیکھ لیں۔ اس پر تمہیں بجلی نے لے ڈالا اور تم تکتے ہی رہ گئے) پھر تمہیں تمہارے مرنے کے بعد جلا دیا تاکہ تم شکر کرو۔)

(۱) یہود جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا انکار کرتے تھے تو ان کو انکے اسلاف کی سرکشی یاد دلائی گئی جنھوں نے حضرت موسیٰ سے کہا تھا کہ جبتک وہ خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لیں گے۔ ایمان قبول نہ کرینگے۔ یہ آیت ثابت کر رہی ہے کہ خدا کی رویت ممکن نہیں کیونکہ اگر انکا یہ مطالبہ جائز ہوتا تو مورد عقاب نہ بنتے۔ مسئلہ رویت باری تعالیٰ کی تحقیق آئندہ آئیگی۔

(۲) خداوند عالم نے بنی اسرائیل کے ناجائز سوال پر غضبناک ہو کر آسمان سے بجلی گرائی جس سے وہ جل کر مردہ ہو گئے۔ پھر دوبارہ ان کو اپنی قدرت کاملہ سے زندہ کیا۔ بعض منکرین قدرت باریتعالیٰ نے "موت" کی تفسیر "غشی" سے کی ہے جو آیت کے مفہوم ظاہری کے سراسر خلاف ہے۔ قرآن کیا کسی دوسرے کلام کے معنی میں بھی خواہ مخواہ تصرف کرنا جائز نہیں۔ البتہ جناب موسیٰ پر غشی طاری ہوگئی تھی کیونکہ سورۂ اعراف میں آپ کی بابت "فَلَمَّا أَفَاقَ" کہا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ افاقہ غشی سے ہوتا ہے نہ کہ موت سے۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝ ترجمہ:۔ (اور ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا اور تم پر من و سلویٰ اتارا۔ (اور یہ بھی تو کہہ دیا تھا کہ) جو ستھری نفیس روزیاں تمہیں دی ہیں۔ انھیں شوق سے کھاؤ اور ان لوگوں نے ہمارا تو کچھ بگاڑا نہیں مگر اپنی ہی جانوں پر ستم ڈھاتے رہے)

اس آیت کے بعض توضیحات آیت مابعد کے ذیل میں ذکر کئے گئے ہیں۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ٥ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ٥ ترجمہ:- (اور وہ وقت بھی یاد کرو جب ہم نے تم سے کہا کہ اس گاؤں اریحا (شامی علاقہ) میں جاؤ اور اس میں جہاں چاہو فراغت سے کھاؤ (پیو) اور دروازے پر سجدہ کرتے ہوئے اور زبان سے حطۃ (بخشش) کہتے ہوئے آؤ تو ہم تمہاری خطائیں بخشدینگے۔ اور ہم نیکی کرنے والوں کی نیکی (ثواب) بڑھا دیں گے۔ تو جو بات ان سے کہی گئی تھی اسے شریروں نے بدل کر دوسری بات کہنی شروع کر دی تب ہم نے ان لوگوں پر جنھوں نے شرارت کی تھی، اُن کی بدکاری کی وجہ سے آسمانی بلا نازل کی۔)

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو مصر سے لیکر نکلے تھے تو خدا نے وعدہ کیا تھا کہ قوم عمالقہ سے لڑو گے تو تم کو سلطنت عطا کرینگے۔ اس پر حضرت موسیٰ نے ان کو ہر چند آمادہ کرنا چاہا مگر نہ ہوئے (آمادہ) آخر اس کی سزا میں چالیس سال تک کیلئے سخت حیرانی میں مبتلا کر دیئے گئے۔ (اس کی مفصل کیفیت سورۂ مائدہ رکوع ۴ میں مذکور ہے) آخر جب بہت حیران ہو چکے تو حضرت موسیٰ کی دعا سے ان پر ابر کا سایہ کیا گیا۔ اور من و سلویٰ نازل ہونے لگا۔ جب اس میں بھی شرارت کرنے لگے۔ اور لہسن و پیاز وغیرہ کے طالب ہوئے تو وہ بھی موقوف کر دیا گیا۔ اسی حیرانی کے زمانے میں حضرت موسیٰ نے وفات پائی۔ جب وہ حیرانی کی مدت ختم ہوئی تو حضرت یوشع بن نون کے حکم سے ان لوگوں نے عمالقہ کے ملک پر حملہ کیا اور کئی شہر فتح کر لئے مگر ان کو یہ حکم بھی دیا گیا تھا کہ جب پہلا شہر فتح کرو تو حطۃ (یعنی بخشش) کہتے ہوئے ان کے دروازے میں قدم رکھو۔ لیکن یہ لوگ وہاں بھی اپنی شرارت سے باز نہ آئے۔ اور بجائے حطۃ کے حنطۃ (گیہوں) کہنا شروع کیا۔ اس سرکشی کی سزا انکو یوں دی گئی کہ وبائے طاعون مسلط کیگئی۔ جس سے ایک دن میں چوبیس ہزار آدمی ہلاک ہو گئے اور بلاد مفتوحہ ہاتھ سے نکل گئے۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ٥ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى

طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ترجمہ:- (اور وہ وقت بھی یاد کرو جب کہ موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی مانگا تو ہم نے کہا (اے موسیٰ) اپنی لاٹھی پتھر پر مارو۔ چنانچہ (لاٹھی مارتے ہی) اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور سب لوگوں نے اپنے اپنے پانی پینے کی جگہ سمجھ لی۔ اور ہم نے عام اجازت دیدی کہ) خدا کی دی ہوئی روزی سے کھاؤ پیو اور ملک میں فساد نہ کرتے پھرو۔ اور وہ وقت بھی یاد کرو جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم سے ایک ہی کھانے پر رہا نہ جائے گا۔ تو آپ اپنے پروردگار سے ہمارے لئے دعا کیجئے کہ جو چیزیں زمین سے اگتی ہیں جیسے ساگ پات ککڑی گیہوں مسور اور پیاز (لہسن) من و سلویٰ کی جگہ پیدا کرے۔ موسیٰ نے کہا کیا تم ایسی چیز کو جو ہر طرح بہتر ہے۔ ادنیٰ چیز سے بدلنا چاہتے ہو تو کسی شہر میں اتر پڑو۔ پھر تمہارے لئے سب مطلوب چیزیں موجود ہوں گی۔ اور ان پر رسوائی اور محتاجی کی مار پڑی۔ اور ان لوگوں نے قہر خدا کی طرف پلٹا کھایا۔)

جب اسرائیل کو جنگل میں من و سلویٰ کھانے کے بعد پیاس کی شدت ہوئی تو حضرت موسیٰ کے پاس آئے اور پانی کے طالب ہوئے تب حکم خدا سے حضرت موسیٰ نے ایک پتھر پر عصا مارا۔ اور اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ چونکہ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے۔ اس وقت بھی آپس میں جھگڑنے لگے کہ ہم سب ایک چشمے سے پانی نہ پئیں گے۔ آخر ان کی ہٹ رکھ لی گئی اور ہر ایک قبیلہ کیلئے جداگانہ چشمہ دے دیا گیا۔ پتھر سے پانی نکلنے کو مستبعد سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں۔ خداوند عالم کی قدرت کاملہ ہر ممکن امر کو عالم وجود میں لا سکتی ہے البتہ منکرین اعجاز یہاں بھی تامل کر سکتے ہیں مگر معجزہ کا ممکن ہونا بلکہ واقع ہونا جب دلائل عقلیہ اور نقلیہ سے ثابت ہے تو دلیل محکم کے بعد انکار یا تامل ہٹ دھرمی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ٥ ترجمہ:- (یہ سب اس سبب سے ہوا کہ وہ لوگ خدا کی نشانیوں سے انکار کرتے تھے اور پیمبروں کو ناحق شہید کرتے تھے اور اس وجہ سے (بھی) کہ وہ نافرمانی اور سرکشی کرتے تھے۔)

"بِغَیرِ الحَق" کے معنی "بغیر جرم" کے ہیں اور مقصود کلام یہ ہے کہ بنی اسرائیل انبیاء کو قتل کیا کرتے تھے حالانکہ وہ بالکل بے قصور ہوتے تھے۔ ان سے کبھی کوئی جرم سرزد ہی نہیں ہوتا تھا۔ جس کو ان کے قتل کی حجت قرار دے سکتے۔ اس لفظ کے کہنے کی غرض یہ ہے کہ انبیاء کی عصمت اور بنی اسرائیل کی سفاکی کی مذمت مزید تاکید و تصریح سے بیان کر دی جائے۔ پس یہ احتمال اس لفظ سے کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتا۔ کہ انبیاء کسی وقت میں مستحق قتل بھی ہو سکتے تھے اور انکا قتل کبھی جائز بھی ہو سکتا تھا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ترجمہ:۔ (بیشک مومنوں اور یہودیوں اور نصرانیوں اور لامذہبوں میں سے جو کوئی خدا اور روز آخرت پر ایمان لائے اور اچھے اچھے کام کرتا رہے تو انھیں کیلئے انکا اجر و ثواب ان کے خدا کے پاس ہے اور نہ (قیامت میں) ان پر کسی قسم کا خوف ہوگا نہ وہ رنجیدہ دل ہوں گے۔

(۱) "انّ الذین آمنوا" سے وہ لوگ مراد ہیں جو پیغمبر اسلام کی بعثت سے قبل آپ پر کامل ایمان رکھتے تھے اور یہود و نصاریٰ کی باطل باتوں سے اجتناب کرتے تھے۔ مثلاً قس بن ساعدہ۔ ورقہ بن نوفل سلمانِ فارسی۔ ابوذر غفاری وغیرہم۔ ایسے بہت سے لوگ تھے جو کتب سابقہ کی بشارتوں کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے تھے۔ اور آپکے مبعوث ہونے کے منتظر تھے۔ یہود و نصاریٰ کے عقائد باطلہ و اعمال قبیحہ سے ان کو کچھ واسطہ نہ تھا۔

(۲) "الّذین ھادوا" الخ مبتدا ہے اور "من آمن باللہ" اس کی خبر ہے اور آیت کا محصل یہ ہے کہ جو لوگ آنحضرت کے مبعوث ہونے سے پیشتر آپ پر ایمان رکھتے تھے اور مذہب یہود و نصاریٰ و صابئین کی ظاہر بظاہر پیروی کرنے والوں میں سے جو لوگ آپ کی بعثت کے بعد ایمان لائے ان کو اجر و ثواب عطا کیا جائے گا۔

(۳) "صابئین" سے مجوس۔ کواکب پرست۔ ملائکہ کی عبادت کرنے والے اور ایسے ہی تمام لامذہب لوگ مراد ہیں۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝ ترجمہ:۔ (اور وہ وقت یاد

کرو جب ہم نے (تعمیل تورات کا) تم سے اقرار لیا اور ہم نے تمہارے اوپر طور (سے پہاڑ) کو لٹکایا۔ اور کہا کہ توریت جو ہم نے تم کو دی ہے اس کو مضبوط پکڑے رہو۔ اور جو کچھ اسمیں ہے محفوظ رکھو تاکہ پرہیزگار بن جاؤ پھر اس کے بعد تم اپنے عہد و پیمان سے پھر گئے۔ پس اگر تم پر خدا کا فضل اور اسکی مہربانی نہ ہوتی تو تم نے سخت گھاٹا اٹھایا ہوتا۔

جب جناب موسیٰ توراۃ لے کر اپنی قوم کے پاس آئے اور ان سے فرمایا کہ اس کتاب کے احکام پر عمل کرو تو وہ لوگ کہنے لگے کہ جبتک ہم خدا کو کھلم کھلا نہ دیکھ لیں گے اور وہ خود ہم سے یہ نہ کہدیگا کہ میری یہ کتاب ہے تم اس پر عمل کرو۔ اسوقت تک ہم اس پر عمل نہ کرینگے۔ پس اس نافرمانی و سرکشی کیوجہ سے ان پر بجلی گرائی گئی جس سے سب کے سب ہلاک ہو گئے۔ پھر وہ جب زندہ کئے گئے اور اس کتاب پر عمل کرنے کیلئے ان سے کہا گیا تو اسی انکار پر قائم رہے آخر تنبیہ کے لئے خداوند کریم نے کوہ طور کو ان کے سروں پر بلند کر دیا۔ اور کہا کہ اگر مخالفت پر قائم رہو گے تو کچل دیئے جاؤ گے۔ بعض لوگ اس واقعہ کا محض اس لئے انکار کرتے ہیں کہ توریت میں کہیں مذکور نہیں ہے اور بعض اسوجہ سے منکر نظر آتے ہیں کہ پہاڑ کا بلند ہو جانا امر عجیب و بعید از فہم معلوم ہوتا ہے۔ پہلے منکرین کا جواب یہ ہے کہ توریت میں کسی واقعہ کے مذکور نہ ہونے سے اسکی تکذیب نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ توریت خود قابلِ سند نہیں ہے جیسا کہ سابقاً مذکور ہوا۔

رہی دوسری جماعت منکرین تو ان کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ پہاڑ کا زمین سے بلند ہو جانا عقلاً ممکن ہے اور ہر ممکن امر پر قادر مطلق پوری قدرت رکھتا ہے۔ اگرچہ بعض کا اظہار مخصوص مواقع کے سوا عام طور سے نہیں کرتا۔ جبکہ روزمرہ مشاہدہ میں آنے والے امور کی پوری کیفیت اور ان کے تمام اسباب و علل تک عقل انسانی کی رسائی نہیں ہو سکتی تو بعض خلافِ عادت باتوں کے علل و اسباب کی حقیقت نہ معلوم ہو سکنے سے ان کے واقع ہونے کا انکار کب مناسب ہو سکتا ہے۔؟

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ۝ فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ

ترجمہ:۔ (اور اپنی قوم سے ان لوگوں کی حالت تو تم بخوبی جانتے ہو جو شنبہ کے دن اپنی حد سے گذر گئے (کہ باوجود ممانعت شکار کھیلنے نکلے) تو ہم نے ان سے کہا کہ تم راندے گئے بندر بن جاؤ (اور وہ بندر ہو گئے) پس ہم نے اس واقعہ کو ان لوگوں کے واسطے جن کے سامنے ہوا تھا اور جو اس کے بعد آنے والے تھے عذاب قرار دیا اور پرہیزگاروں کیلئے نصیحت بنا دیا۔)

(۱) یہ واقعہ جناب داؤد علیہ السلام کے عہد کا ہے۔ کچھ بنی اسرائیل دریا کے کنارے شہر ایلہ میں رہتے تھے ان کے لئے شنبہ کا دن عبادت کا معین کیا گیا تھا۔ اور اس میں شکار کھیلنے کی ممانعت کردی گئی تھی۔ مگر انھوں نے اس پر عمل نہ کیا۔ دریا کے کنارے بڑے بڑے گڑھے کھودتے اور نالیوں کے ذریعہ دریا کے پانی کو وہاں تک پہونچاتے۔ جمعہ کے دن نالیاں کھول آتے اور جب پانی کے ساتھ مچھلیاں اس گڑھے میں آکر جمع ہو جاتیں تو شنبہ کے دن وہاں جاکر اسکا دہانہ بند کر دیتے اور یکشنبہ کے دن ان مچھلیوں کو نکال لیتے اس کام کی ہرچند ممانعت کی گئی۔ مگر جب نہ مانے۔ آخرکار جناب داؤد کی بددعا سے چند آدمیوں کے سوا سب کے بندروں کی صورت میں مسخ کر دئے گئے۔ اور تین دن زندہ رہ کر ہلاک ہو گئے۔ اس قصہ کی مزید تفصیل سورہ اعراف میں کی گئی ہے۔

(۲) مجاہد نے شہر ایلہ کے باشندوں کے مسخ کئے جانے کی بابت یہ تاویل کی ہے کہ وہ فی الحقیقت بندر نہیں بنائے گئے تھے بلکہ ان کے قلوب مسخ کر دئے گئے تھے۔ جس سے بندروں کے خصائل ان میں پیدا ہو گئے تھے۔ جسطرح استاد اپنے احمق وبلید شاگرد کو کن حمارا (گدھا ہو جا) کہتا ہے حالانکہ فی الواقع وہ گدھا نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہاں کونوا قردۃ کہا گیا ہے جس سے محض ان کی خصلتوں کا اظہار مقصود ہے اور اس تاویل کی صحت پر دو وجہوں سے استدلال کیا ہے جو مع جواب درج کی جاتی ہیں۔

(پہلی وجہ) یہی ہیکل مشاہد اور جسم محسوس "انسان" کہا جاتا ہے۔ پس اگر اسکی ترکیب و شکل کے بدلے بندر کے بدن کی ترکیب اور شکل پیدا کر دی گئی تو گویا انسان بالکل معدوم کر دیا گیا۔ اور ان کی جگہ پر بندر پیدا کر دیا گیا۔ پس اسکو مسخ کہنا صحیح نہیں بلکہ اعدام و ایجاد کہنا چاہیئے۔

(جواب) اس دلیل کی بنا محض اس فرض پر قائم کی گئی ہے کہ محض بدن محسوس کا نام انسان ہے اور یہ غلط ہے۔ کیونکہ روح وبدن کے مجموعہ کا نام انسان ہے۔ روح کبھی متغیر نہیں ہوتی۔ لیکن بدن کے اجزاء کے تبدیل سے اکثر ہیاۃ میں نمایاں فرق ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ جو ہیئت بچپن یا صحت کے وقت میں ہوئی ہے وہ بوڑھاپے اور بیماری کی حالت میں باقی نہیں رہتی۔ پس جبکہ انسانی جسم کی ہیئت و شکل عام طور سے بھی بدلتی رہتی ہے تو ممکن ہے کہ قدرت خدا سے وہ تغیر اس حد تک پہونچ جائے کہ انسانی شکل و ہیئت کے بجائے کسی دوسرے حیوان کی صورت دکھائی دینے لگے۔ اس صورت میں زیادہ سے زیادہ ایک ہیئت عارضہ کا فنا ہونا اور دوسری شکل کا پیدا ہونا لازم آتا ہے۔ اجزائے اصلیہ وہی باقی رہتے ہیں جو کہ پہلے تھے۔ اور روح کا تعلق اس جسم متغیر سے بھی اسی طرح باقی رہتا ہے جس طرح پہلے تھا اور چونکہ ادراک و احساس اسی روح کا کام ہے لہٰذا مسخ کئے جانے والے اپنی حالت موجودہ کو محسوس کرتے ہیں اور اس سے متألم ہوتے ہیں۔

(دوسری وجہ) اگر مسخ جائز ہو تو ہر حیوان کو دیکھ کر یہ اشتباہ ہو سکے گا کہ وہ پہلے انسان عاقل تھا لہٰذا کوئی مشاہدہ ہمارا حیوانات کی بابت قابلِ اطمینان نہ رہے گا۔

(جواب) یہ دلیل محض وہم و سفسطہ ہے کیونکہ معلوم ہے کہ سلسلۂ مسخ ہر زمانے میں جاری نہیں بلکہ بعض انبیاء کے عہد میں کچھ لوگ مسخ کئے گئے تھے اور وہ بہت جلد ہلاک بھی ہو گئے۔ پس ہر بندر، کتے، بلی۔ کو دیکھ کر یہ شبہ کرنے کی بجز خللِ دماغ اور کوئی وجہ نہیں کہ شاید وہ پہلے انسانِ عاقل رہے ہوں۔ بالجملہ مسخ کا وقوع عقلاً جائز ہے اور آیت کے مفہوم ظاہر میں خواہ مخواہ تاویل کرنے کی حاجت نہیں۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً قَالُوا أَتَتَّخِذُنَا
هُزُوًا قَالَ أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ○ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ
لَنَا مَا هِيَ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ
فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ○ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْنُهَا قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ
إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ○ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ
لَنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ○ قَالَ إِنَّهُ
يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَا شِيَةَ فِيهَا
قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ○ وَإِذْ قَتَلْتُمْ
نَفْسًا فَادَّارَأْتُمْ فِيهَا وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ○ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ
بِبَعْضِهَا كَذَٰلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَىٰ وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ○

ترجمہ:۔ (اور اسوقت کو یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ خدا تم لوگوں کو تاکیدی حکم کرتا ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو۔ وہ لوگ کہنے لگے کیا تم ہم سے دل لگی کرتے ہو موسیٰ نے کہا میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں۔ کہ میں جاہل بنوں (تب) وہ لوگ کہنے لگے کہ (اچھا) تم اپنے خدا سے دعا کرو کہ وہ ہمیں بتا دے کہ وہ گائے کیسی ہو؟ موسیٰ نے کہا کہ خدا فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ تو بہت بوڑھی ہو اور نہ بچھیا بلکہ اوسط درجہ کی ہو غرض تم کو جو حکم دیا گیا ہے اسکو بجا لاؤ وہ کہنے لگے۔ تم اپنے خدا سے دعا کرو کہ ہمیں یہ بتا دے کہ اس کا رنگ کیا ہو۔ موسیٰ نے کہا کہ خدا فرماتا ہے وہ گائے خوب گہرے زرد رنگ کی ہو کہ دیکھنے والے اسے دیکھ کر خوش ہو جائیں۔ تب کہنے لگے کہ تم اپنے خدا سے دعا کرو کہ وہ ہمیں یہ بتا دے

maablib.org

کہ وہ گائے اور کیسی ہو۔ اسلئے کہ ہماری نظر میں گائیں ملے جلے انداز کی ہیں۔ اور خدا نے چاہا تو ہم ضرور اسکا پتہ لگالیں گے۔ موسیٰ نے کہا خدا فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ تو اتنی سدھائی ہوئی ہو کہ زمین جوتے اور کھیتی سینچے۔ بھلی چنگی ایسی یکرنگ ہو کہ اس میں کوئی دھبہ تک نہ ہو۔ وہ بولے اب (جاکے) آپنے ٹھیک ٹھیک بیان کیا۔ غرض کہ ان لوگوں نے وہ گائے حلال کی حالانکہ امید نہ تھی کہ وہ ایسا کریں گے۔ اور جب ایک شخص کو تم نے مارڈالا اور اس کی بابت پھوٹ پڑگئی (ایک دوسرے کو قاتل بتانے لگا) اور جو تم چھپاتے تھے خدا کو اسکا ظاہر کرنا منظور تھا پس ہم نے کہا کہ اس گائے کا ایک ٹکڑا لے کر اس (کی لاش) پر مارو۔ یوں خدا مردے کو زندہ کرتا ہے۔ اور تم کو اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتا ہے۔)

(۱) بنی اسرائیل میں سے کسی شخص نے اپنے ایک عزیز قریب کو اسکے مال کا وارث بننے کیلئے قتل کیا۔ اور لاش شاہراہ میں ڈال دی۔ اور پھر خود ہی جناب موسیٰ کے پاس آکر قصاص کا دعویدار ہوا۔ بنی اسرائیل میں اسکا چرچا ہونے لگا۔ ہر قبیلہ دوسرے کو اس قتل کا مجرم ٹھہراتا تھا۔ بالآخر خدا کا یہ حکم ہوا کہ ایک گائے کی قربانی کرو۔ اور اسکا ایک ٹکڑا لے کر اس لاش پر مارو وہ شخص خود زندہ ہو کر اپنے قاتل کا نام بتادیگا مگر انھوں نے بجائے فوراً تعمیل کرنے کے محض ٹالنے کیلئے جناب موسیٰ پر استہزا کا الزام لگایا۔ پھر یہ پوچھنا شروع کردیا کہ وہ کیسی ہو۔ کس عمر کی ہو۔ جب اسکا جواب دے دیا گیا تو پھر پوچھا کہ اسکا رنگ کیا ہو۔ تو اسکا رنگ بھی بتادیا گیا۔ مگر پھر بھی یہ سوال کیا کہ اس کے اور صفات کیا ہوں۔ غرض کچھ صفتیں بیان کردی گئیں۔ اگر پہلے ہی خدا کے حکم کی تعمیل کر دیتے تو انکو کسی دقت کا سامنا نہ ہوتا۔ کیونکہ محض ایک گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اور کسی رنگ اور صفت کی تخصیص نہیں کی گئی تھی۔ لیکن جسقدر وہ سوال کرتے رہے اسی قدر قیود بڑھتے گئے۔ آخر کار نوبت یہ پہونچی کہ ایسی گائے کا ملنا دشوار ہوگیا جس میں وہ تمام صفات موجود ہوں۔ عرصے تک تلاش کرنے کے بعد ایک شخص کے پاس ملی اور قیمت یہ دینی پڑی کہ اس کی کھال میں جتنا سونا آئے۔ غرض کسی طرح ان لوگوں نے گائے ذبح کرکے ایک ٹکڑا گوشت کا اس میت پر مارا۔ جس سے وہ اٹھ بیٹھی۔ اور اپنے قاتل کا نام بتایا۔

(۲) اگرچہ خداوند عالم بغیر کسی تدبیر خاص کے اس میت کے زندہ کردینے پر قادر تھا مگر جن لوگوں کو بجز کفر وعصیان کے ایمان سے کبھی واسطہ ہی نہیں رہا۔ وہ یہ کہے بغیر نہ رہتے کہ موسیٰ نے سحر کیا۔ لہٰذا خداوند عالم نے چاہا کہ خود انھیں کے ہاتھوں سے وہ میت زندہ کیجائے۔ اور وہ بھی ایک ایسے امر کے وسیلہ سے جسکو بظاہر مردے کو زندہ ہوسکنے سے کوئی تعلق ہی نہ ہو تاکہ ان کو دم مارنے کا موقع نہ ملے۔ اور اس کے لئے

مخصوص طور پر گائے کی قربانی کرنے کا حکم دینے میں یہ بھی مصلحت تھی کہ وہ اس کی پرستش کے دلدادہ رہ چکے تھے۔ جیسا کہ پہلے معلوم ہوچکا۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۚ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ۚ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ترجمہ:۔ (پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہوگئے۔ پس وہ مثل پتھر کے (سخت) تھے۔ یا اس سے بھی زیادہ کرخت، کیونکہ پتھروں میں بعض تو ایسے ہوتے ہیں (کہ) ان سے نہریں جاری ہوجاتی ہیں۔ اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں درار پڑجاتی ہے اور ان میں سے پانی (رس رس کر) نکلنے لگتا ہے اور بعض پتھر تو ایسے ہوتے ہیں کہ خدا کے خوف سے گر پڑتے ہیں اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے خدا غافل نہیں ہے۔

یہودیوں سے کہا جارہا ہے کہ اتنے واضح معجزات دیکھنے کے بعد بھی تم انسانی قدروں سے بالکل دور رہے۔ تمہارے دل نہیں ہیں۔ پتھر ہیں بلکہ پتھر سے بھی زیادہ کوئی سخت چیز۔ اس لئے پتھر سے تو مذکورہ بالا فوائد حاصل بھی ہوا کرتے ہیں مگر تمہارے دل تو ایسے خشک ہیں کہ ان میں نام کو بھی تری نہیں ہے۔ نہ بندگانِ خدا کو تم سے فائدہ پہنچتا ہے اور نہ حقوق خدا تم سے ادا ہوتے ہیں۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ ترجمہ (کیا تم یہ لالچ رکھتے ہو کہ وہ تمہارا (۱) ایمان لائیں گے۔ حالانکہ ان میں کا ایک گروہ (سابق) میں ایسا تھا کہ خدا کا کلام سنتا تھا اور اچھی طرح سمجھنے کے بعد اسے الٹ پلٹ کردیتا تھا حالانکہ وہ خوب جانتے تھے)

(۱) مسلمانوں سے کہا جارہا ہے کہ جب وہ (یہود) اتنے سنگ دل ہیں تو ان سے ایمان لانے کی توقع رکھنا بے کار ہے خصوصاً جب کہ ان کے اسلاف کے حالات پر نظر جاتی ہے۔ ان میں کا ایک گروہ جو پڑھا لکھا اور شائستہ تھا ان کا کردار یہ نظر آتا ہے کہ عام بنی اسرائیل تک پیغام پہونچانے میں وہ کلام الٰہی میں ادل بدل کر دیا کرتے تھے۔ حالانکہ وہ مفہوم کلام خدا بھی اچھی طرح جانتے تھے اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ ہم تحریف کی نازیبا حرکت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ پھر جب ان کے اچھے لوگوں کا یہ وطیرہ عہد موسیٰ میں تھا تو ان کے پست درجہ اور جاہل افراد سے پیغمبر اسلام پر ایمان لانے کی کیا

امید کی جاسکتی ہے۔

(۲) یہ بھی احتمال ہے کلام الٰہی سے مراد توریت کے وہ حصے ہوں جن میں آخری نبی کے صفات مذکور تھے۔ لیکن جب آخری نبیؐ آگیا تو اس میں طرح طرح کی تاویلیں اور تحریفیں کرنے لگے تو جن میں اس طرح کی ہٹ دھرمی ہو تو پھر ان کے ایمان لانے کی توقع فضول ہی تو ہوگی۔

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُم بِهِ عِندَ رَبِّكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۝ وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ترجمہ (اور جب ان لوگوں سے ملاقات کرتے ہیں جو ایمان لائے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم تو ایمان لاچکے۔ اور جب ان سے بعض بعض کے ساتھ تخلیہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ جو کچھ خدا نے تم پر (توریت میں) ظاہر کیا ہے کیا تم مسلمانوں کو بتادوگے تاکہ اس کے سبب سے (کل) تمہارے خدا کے پاس تم پر حجت لائیں۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے (لیکن) کیا وہ لوگ (اتنا بھی نہیں جانتے کہ وہ لوگ جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں خدا سب کو جانتا ہے۔ اور کچھ ان میں ایسے اَن پڑھ ہیں کہ وہ کتاب خدا کو اپنے مطلب کی باتوں کے سوا کچھ نہیں سمجھتے اور وہ فقط خیالی میں رہتے ہیں")

(۱) اس آیت میں یہود کی وہ مخفی گفتگو بیان کی گئی ہے جو باہم تخلیہ میں کیا کرتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بجز وحی کے اسکے معلوم ہونے کا کوئی اور ذریعہ نہ تھا لہٰذا یہ آیت اعجاز قرآن کی بین دلیل ہے۔

(۲) یہود میں کچھ لوگ منافق بھی تھے جب وہ اصحاب رسول سے ملتے تو کہتے کہ ہم بھی تمہاری طرح ایمان لاتے ہیں اور شہادت دیتے ہیں کہ تمہارا رسول سچا ہے اور اسکا کلام حق ہے۔ ہم اس کے اوصاف اپنی کتابوں میں بھی مذکور پاتے ہیں۔ پس جب یہ لوگ تخلیہ میں بیٹھتے تو انکے روسا انکو ملامت کرتے ہیں کہ تم ان بشارات واوصاف کو جو توریت میں مذکور ہیں مسلمانوں سے بیان کرکے انکو حجت قائم کرنے کا موقع کیوں دیتے ہو۔ کیا تم یہ نہیں سمجھتے کہ اس سے تمہارا عذر بالکل قطع ہوجاتا ہے؟

(۳) آخر میں اُن اَن پڑھ لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو بطور تقلید اپنے گمان پر عمل پیرا ہوگئے حالانکہ معاشرت اور معاملات میں وہ اپنے علماء کی بددیانتی سے بخوبی واقف تھے۔ یہیں سے یہ فرق سمجھ میں آتا ہے کہ

ہر عالم کی تقلید نہیں درست ہے بلکہ اس کی تقلید کرے جو اپنے نفس کا حافظ اور اپنے دین کا محافظ ہو اپنی نفسانی خواہشوں کا مخالف ہو اور اپنے مالک کے احکام کا پابند ہو۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ ۝ وَقَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِندَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ بَلَىٰ مَن كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ترجمہ:- (پس وائے ہو ان لوگوں پر جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں۔ پھر (لوگوں سے) کہتے پھرتے ہیں کہ یہ خدا کے یہاں سے (آئی) ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے تھوڑی قیمت (دنیوی فائدہ) حاصل کریں۔ پس افسوس ہے ان پر کہ انکے ہاتھوں نے لکھا اور پھر افسوس ہے ان پر کہ وہ ایسی کمائی کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ گنتی کے چند دنوں کے سوا ہمیں آگ چھوئے گی بھی تو نہیں (اے رسول) ان لوگوں سے کہدو کہ کیا تم لوگوں نے خدا سے کوئی اقرار لے لیا ہے کہ پھر وہ کسی طرح اپنے اقرار کے خلاف ہرگز نہ کرے گا یا بے سمجھے بوجھے خدا پر طوفان جوڑتے ہو ہاں بے شک جس نے برائی حاصل کی۔ اور اسکے گناہ نے اسے گھیر لیا تو وہ لوگ ضرور دوزخی ہیں اور ہمیشہ اسی دوزخ میں رہیں گے۔ اور جو لوگ ایماندار ہیں اور انھوں نے اچھے کام کیے ہیں پس وہی جنتی ہیں اور ہمیشہ اسی جنت میں رہیں گے۔)

(۱) آیت میں ویل سے مراد عذاب ہے اگرچہ دراصل کلمۂ ویل تاسف وتحسر کے لیے وضع ہوا ہے جیسا کہ خود قرآن حکیم میں آیا ہے یا ویلتنا ما لهذا الکتاب الخ ہائے افسوس یہ کیا اعمالنامہ ہے۔

(۲) علمائے یہود کی یہ بہت بڑی جسارت تھی کہ حقیر منفعت کے لیے وہ اپنے ہاتھ کی تحریر کو خدا کیطرف منسوب کرتے تھے اس سے جہاں ان کی پست ذہنیت کا ثبوت ملتا ہے وہاں ان کے گرد وپیش کے جاہلوں کی حالت کا بھی اندازہ ہوجاتا ہے۔

(۳) قرآن یہودیوں کے اس تخیل کو بھی باطل قرار دیتا ہے کہ اگر وہ جہنم میں جائیں گے بھی تو برائے نام۔ بلکہ قرآن نے ہر قوم کے لیے ایک عمومی معیار پیش کر دیا ہے کہ جو بھی بدی کا مرتکب ہوگا۔ اور گناہ

maablib.org

انکو ہر طرف سے گھیر لیں گے۔ تو ہمیشہ ہمیشہ وہ جہنم میں جلے گا۔ اس لئے کہ گناہوں کے احاطہ کر لینے کا یہ آخری نتیجہ شرک ہوتا ہے اور شرک کبھی نہ بخشا جائے گا۔ اسی طرح عمل صالح بجالانے والے مومنین کی ابدی منزل جنّت ہوگی۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ○ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ○

ترجمہ: اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل (جو تمہارے بزرگ تھے) سے عہد و پیمان لیا تھا کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا (نیز) قرابتداروں اور یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ اور تمام لوگوں کے ساتھ اچھی گفتگو کے ساتھ پیش آنا۔ اور برابر نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا پھر تم میں سے تھوڑے آدمیوں کے سوا سب کے سب پھر گئے۔ اور تم لوگ ہو ہی اقرار سے منہ پھیرنے والے اور (وہ وقت) یاد کرو جب ہم نے تمہارے بزرگوں سے عہد لیا تھا کہ آپس میں خونریزیاں نہ کرنا اور نہ اپنے لوگوں کو شہر بدر کرنا تو تم (تمہارے بزرگوں) نے اقرار کیا تھا اور تم بھی اس کی گواہی دیتے ہو کہ ہاں ایسا ہوا تھا۔ پھر وہی لوگ تو تم ہو کہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو اور اپنوں میں سے ایک جتھے کے ناحق اور زبردستی حمایتی بنکر دوسرے کو شہر بدر کرتے ہو اور لطف تو یہ ہے کہ اگر وہی لوگ قیدی بنکر تمہارے پاس مدد مانگنے آتے ہیں تو انکو تاوان دے کر چھڑا لیتے ہو حالانکہ انکا نکالنا ہی تم پر حرام کیا گیا تھا تو پھر کیا تم کتاب خدا کی بعض باتوں

پر ایمان رکھتے ہو اور بعض سے انکار کرتے ہو پس تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس زندگی میں ان کو رسوائی ہو اور قیامت کے دن بڑے سخت عذاب کی طرف پلٹائے جائیں اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خرید لی۔ پس نہ ان کے عذاب ہی میں تخفیف کیجائیگی اور نہ ان کی کسی طرح مدد کیجائے گی۔

ان آیات میں یہود کی عہد شکنی اور ان کی تعدی کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ اور اس سلسلے میں جو دنیوی اور اخروی ذلتیں اور شدائد انکو برداشت کرنے پڑے انکا تذکرہ کیا گیا ہے قرآن حکیم میں ان امور کا ذکر اس لئے بھی کیا گیا ہے کہ امت محمدیہ اس سے عبرت حاصل کرے۔ اور نصیحت پکڑے اور اس قسم کے حرکات کا ظہور اس سے نہ ہو۔ ورنہ اسکا بھی یہی نتیجہ ہوگا۔ کیونکہ امت سے خدا کی کوئی قرابت نہیں۔ ان آیات کی روشنی میں امت محمدیہ کے اس سلوک پر غور کیا جا سکتا ہے جو آل محمد اور ان کے مخصوص چاہنے والوں کے ساتھ کیا گیا۔ خواہ وہ جناب ابوذر کا واقعہ ہو یا امام حسینؑ کا

(۲) کتاب خدا کی بعض باتوں پر ایمان اور بعض سے انکار کا ایک ظاہری رخ یہ ہے کہ ایمان و کفر ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں۔ لیکن نتیجہ میں عذاب دائم کی خبر نے بتا دیا کہ جزئی ایمان نافع نہیں ہے اور نہ اس سے عذاب میں تخفیف ہوگی بلکہ یہ حرکت تو اور شدت عذاب کی موجب ہے کیونکہ یہ مذہب کے ساتھ ایک طرح کی بازی گری ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ○ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ○

ترجمہ: اور یقیناً ہم نے موسیٰ کو کتاب (توریت) دی اور ان کے بعد بہت سے پیغمبروں کو ان کے قدم بہ قدم چلایا اور مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھی بہت سے واضح اور روشن معجزے دیئے اور پاک روح جبریل کے ذریعہ سے ان کی مدد کی۔ کیا تم ایسے بد دماغ ہو گئے کہ جب کوئی پیغمبر تمہارے پاس تمہاری خواہش نفسانی کیخلاف کوئی حکم لیکر آیا تو تم اکڑ بیٹھے پھر تم نے بعض پیغمبروں کو جھٹلایا اور بعض کو جان سے مار ڈالا اور کہنے لگے کہ ہمارے دلوں پر غلاف چڑھا ہوا ہے۔ بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے خدا نے ان پر لعنت کی ہے۔

پس کم ہی لوگ ایمان لاتے ہیں۔"

ان آیات میں عہد جناب موسیٰ سے عہد ختمی مرتبت تک کے درمیانی انبیا کا اجمالی ذکر کر کے یہ بتایا ہے کہ یہود کا مذکورہ بالا کردار ایک مستقل کردار تھا۔ آج ہمارے نبی آخر کی مخالفت کوئی نئی چیز نہیں ہے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ ترجمہ:۔ (اور جب ان کے پاس خدا کی طرف سے کتاب (قرآن) آئی اور وہ اس (کتاب توریت) کی جو ان کے پاس ہے تصدیق بھی کرتی ہے اور اس سے پہلے (اسی کی امید پر) کافروں پر فتحیاب ہونے کی دعائیں مانگتے تھے۔ پس جب ان کے پاس وہ چیز جسے پہچانتے تھے آ گئی تو لگے انکار کرنے۔ پس کافروں پر خدا کی لعنت ہے)

لما معھم سے مراد وہ بشارات ہیں جو توریت میں مذکور ہیں۔ انھیں کے بنا پر یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے دعا کیا کرتے تھے کہ خدا کرے وہ نبی جلد ظاہر ہوں۔ جن کی بشارات دی گئیں ہیں تا کہ ہم کو کفار پر غلبہ حاصل ہو۔ لیکن جب وہ نبی جنکا ان کو انتظار تھا مبعوث کیے گئے تو یہود ان کے منکر ہو گئے جس سے خدا کی لعنت کے مستحق ٹھہرے۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ ترجمہ (کیا ہی برا ہے یہ کہ وہ اپنی جانوں کو اس بات پر بیچ بیٹھے ہیں کہ وہ خدا کی اس تنزیل کا (جو موسیٰ پر در باب محمد نازل ہوئی تھی) انکار ہی کریں گے۔ محض اس رشک و حسد میں کہ خدا اپنی عنایت سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے کتاب نازل کر دے۔ پس انپر غضب پر غضب ٹوٹا۔ اور کافروں کے لئے بڑی رسوائی کا عذاب ہے۔)

(۱) اس آیت میں خدا نے یہودیوں کی اس حرکت کی مذمت کی ہے کہ وہ اپنی معمولی اور فانی ہدیہ اور تحفے کے سلسلے کو باقی رکھنے کیلئے ابدی نعمت کو گنوا بیٹھے۔ اور اس نبی رحمت سے انکار کر دیا جس کی بشارات ان کی کتاب میں موجود ہے۔

(۲) غضب بالائے غضب سے مراد یہ ہے کہ پہلا غضب تو جناب عیسیٰ کی تکذیب سے ان پر نازل ہوا اور دوسرا غضب جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب سے نازل ہوا۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۚ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝ ترجمہ:۔ (اور جب ان سے کہا گیا کہ جو (قرآن) خدا نے نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ۔ تو کہنے لگے کہ ہم تو اسی کتاب (توریت) پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل کی گئی تھی۔ اور اس کو جو اس کے بعد (آئی) ہے نہیں مانتے۔ حالانکہ وہ (قرآن) حق ہے اور اس کتاب (توریت) کی جو ان کے پاس ہے تصدیق بھی کرتی ہے (اے پیغمبر) ان سے پوچھو کہ اگر تم لوگ مومن تھے تو پھر کیوں خدا کے پیغمبروں کو سابق میں قتل کرتے تھے۔ اور تمہارے پاس موسیٰ تو واضح اور روشن معجزے لے کر آ ہی چکے تھے۔ پھر تم نے ان کے بعد بچھڑے کو (خدا) بنا ہی لیا۔ اور اس سے تم خود ظالم ٹھہرے۔ اور یاد کرو جبکہ ہم نے تم سے عہد لیا اور (تمہاری عدول حکمی کیوجہ سے) کوہ طور کو تمہارے سر پر لٹکایا اور (کہا کہ یہ کتاب توریت) جو ہم نے تم کو دی ہے مضبوطی سے لئے رہو اور (جو کچھ اس میں ہے) سنو۔ تو کہنے لگے سنا تو (لیکن) ہم اس کو مانتے نہیں اور ان کی بے ایمانی کی وجہ سے (گویا) بچھڑے کی الفت گھول کے ان کے دلوں میں پلا دی گئی (اے رسول) ان لوگوں سے کہدو کہ اگر تم ایمان دار تھے تو تمکو

تمہارا ایمان کیا ہی بُرا حکم دیتا تھا (اے رسول) ان لوگوں سے کہدو کہ اگر خدا کے نزدیک آخرت کا گھر (بہشت) خاص تمہارے واسطے ہے اور ان لوگوں کے لئے نہیں تو اگر تم سچے ہو تو موت کی آرزو کرو (تاکہ بہشت میں جلد پہونچ جاؤ) لیکن وہ ان اعمال بد کیوجہ سے جن کو ان کے ہاتھوں نے پہلے بھیج دیا ہے ہرگز موت کی آرزو نہ کریں گے۔ اور خدا ظالموں سے خوب واقف ہے۔ اور (اے رسول) تم انھیں کو زندگی کا سب سے زیادہ حریص پاؤ گے۔ بلکہ ان مشرکوں (مجوسیوں) سے بھی زیادہ حریص (جن کا نظریہ ہے کہ ما بعد الموت کچھ نہیں ہے) ان میں کا ہر شخص چاہتا ہے کہ کاش اسکو ہزار برس کی عمر دی جاتی حالانکہ اگر اتنی طولانی عمر دی بھی جائے تو وہ (خدا کے) عذاب سے چھٹکارا دینے والی نہیں ہے۔ اور جو کچھ وہ لوگ کرتے ہیں خدا اسے خوب دیکھ رہا ہے۔)

ان آیات میں قدرت نے یہود کے دعوائے ایمان کو کئی دلیلوں سے رد کر دیا ہے۔

پہلی دلیل یہ دی ہے کہ اگر تم مومن تھے تو عہد سابق میں نبیوں کو کیوں قتل کرتے تھے۔ کہیں مومن بھی انبیاء کو قتل کرتے ہیں۔؟

دوسری دلیل یہ دی ہے کہ موسیٰ کی رہنمائی کے باوجود انکی مختصر سی غیبت میں بچھڑے کی پرستش کیوں کرنے لگے۔ کیا یہی ایمان کی علامت ہے؟

تیسری دلیل یہ دی ہے کہ اگر تم مومن تھے تو توریت کے احکام پر عمل کیوں ترک کر دیا۔ اگر ان پر عمل کرتے تو آج نبی آخر کی بھی تصدیق کرتے۔

چوتھی دلیل یہ دی ہے کہ جب تم بہشت کو اپنا مخصوص حصہ سمجھتے ہو تو موت کی آرزو کیوں نہیں کرتے۔ تمہارا موت سے فرار اور طولانی زندگی کی ہوس یہ خود بتاتی ہے کہ تم اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہو

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ مَن كَانَ عَدُوًّا لِّلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِينَ ۝

ترجمہ (اے رسول) ان لوگوں سے کہدو کہ جو جبرئیل کا دشمن ہے (اسکا خدا دشمن ہے) کیونکہ اس فرشتہ نے خدا کے حکم سے (اس قرآن کو) تمہارے دل پر اتارا ہے اور وہ ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہے جو (پہلے نازل ہو چکی ہیں اور اب) اس کے سامنے

موجود ہیں۔ اور ایمانداروں کے واسطے خوشخبری ہے جو شخص خدا اور اسکے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبرئیل و میکائیل کا دشمن ہو تو بیشک خدا بھی ایسے کافروں کا دشمن ہے۔"

یہود جبرئیل امین سے عداوت رکھتے تھے۔ اور اسکی وجہ یہ تھی کہ جبرئیل نے ایک مرتبہ کوہ طور کو زمین سے اٹھا کر ان کے سروں پر لٹکایا تھا۔ اور ہلاک کر دیئے جانے کی دھمکی دی تھی۔ نیز یہود کو خیال تھا کہ خدا نے جبرئیل کو یہ حکم دیا تھا کہ وحی بنی اسرائیل میں سے کسی شخص کے پاس لے جائیں مگر وہ پیغمبر اسلام کے پاس لائے اور ان کو اپنی مرضی سے نبی بنا دیا۔ اس خیال کو رد کرنے کیلئے خداوند عالم نے فرمایا کہ جبرئیل خدا کی اجازت سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی لیکر اترے نہ کہ اپنی مرضی سے۔

وَلَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ ۖ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ ۝ أَوَكُلَّمَا عَاهَدُوا عَهْدًا نَّبَذَهُ فَرِيقٌ مِّنْهُم ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝

ترجمہ:۔ (اور اے رسول) ہم نے تم پر ایسی نشانیاں نازل کی ہیں جو واضح اور روشن ہیں اور نافرمانوں کے سوا ان کا کوئی انکار نہیں کر سکتا اور (ان کی یہ حالت ہے کہ) جب کبھی کوئی عہد کیا تو ان میں سے ایک فریق نے توڑ ڈالا بلکہ ان میں سے اکثر تو ایمان ہی نہیں رکھتے اور جب ان کے پاس خدا کیطرف سے رسول (محمد) آیا۔ اور وہ اس کتاب (توریت) کی جو ان کے پاس ہے تصدیق کرتا ہے تو ان اہل کتاب کے ایک گروہ نے کتاب خدا کو اپنے پس پشت پھینکدیا گویا وہ لوگ کچھ جانتے ہی نہیں۔

تقریباً اسی مضمون کی آیت پہلے گذر چکی ہے۔

وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُو الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ ۖ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا أُنزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ ۚ وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ أَحَدٍ حَتَّىٰ يَقُولَا إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۖ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ ۚ وَمَا هُم بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا

يَنْفَعُهُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ڞ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ ترجمہ:- (اور اس منتر کے پیچھے پڑ گئے جس کو سلیمان کے زمانۂ سلطنت میں شیاطین جپا کرتے تھے حالانکہ سلیمان نے کفر نہیں اختیار کیا لیکن شیطانوں نے کفر اختیار کیا کہ وہ لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے اور وہ چیزیں جو ہاروت و ماروت دونوں فرشتوں پر بابل میں نازل کی گئیں تھیں۔ حالانکہ یہ دونوں فرشتے کسی کو سکھاتے نہ تھے۔ جبتک یہ نہ کہدیتے تھے کہ ہم دونوں تو فقط (ذریعہ) آزمائش ہیں۔ پس تو (اس پر عمل کر کے) بے ایمان نہ ہو جانا اس پر بھی اُن سے وہ (ٹوٹکے) سیکھتے تھے۔ جن کی وجہ سے میاں بیوی میں تفرقہ ڈال دیں۔ حالانکہ بغیر اذن خداوندی وہ اپنی باتوں سے کسی کو ضرر نہیں پہونچا سکتے تھے اور یہ لوگ ایسی باتیں سیکھتے تھے جو خود انھیں کو نقصان پہونچاتی تھیں اور کچھ (نفع) نہ پہونچاتی تھیں باوجودیکہ وہ یقیناً جان چکے تھے کہ جو شخص ان (برائیوں) کا خریدار ہوا وہ آخرت میں بے نصیب ہے اور بے شبہ وہ (معاوضہ) بہت ہی برا ہے جس کے بدلے انھوں نے اپنی جانوں کو بیچا کاش (اسے کچھ) سوچے سمجھے ہوتے۔ اور اگر وہ ایمان لاتے اور (جادو وغیرہ سے) بچ کر پرہیز گار بنتے تو خدا کی درگاہ سے جو ثواب ملتا وہ اس سے کہیں بہتر ہوتا۔ کاش یہ لوگ (اتنا تو) سمجھتے۔)

(۱) "تتلو" کا استعمال جب حرف جار "علیٰ" کے ساتھ ہوتا ہے تو اسکے معنی "کذب" کے ہوتے ہیں پس "ما تتلوا الشیاطین علیٰ ملک سلیمان" کا مطلب یہ ہے کہ شیاطین ملکِ سلیمان پر کذب و افترا کیا کرتے تھے کہ وہ سحر ہی کے ذریعے حاصل ہوا تھا۔

(۲) بعض انبیاء کے زمانہ میں لوگوں نے جادوگری میں خوب مشق بہم پہونچائی تھی۔ اور اس سے علاوہ دینی و دنیوی مفاسد کے بڑی خرابی یہ پیدا ہو گئی تھی کہ عوام ناس سحر و معجزہ میں تمیز نہ کر سکتے تھے اور انبیاء کے معجزات کو بھی سحر ہی کا کرشمہ سمجھتے تھے۔ اس لئے خداوند عالم نے دو فرشتوں کو جن کے نام ہاروت و ماروت تھے۔ انسانی شکل میں بھیجا تاکہ لوگوں کو سحر کی حقیقت بتائیں اور اس کی مضرتوں کو ظاہر کر کے انکو جادوگری سے روکیں۔ پس وہ فرشتے لوگوں کو سحر کی حقیقت سمجھاتے تھے اور ساتھ ہی اس کے صاف طور سے کہدیتے تھے کہ دیکھنا کہ ہمارا بھیجنا تمہارے لئے آزمائش ہے ایسا نہ ہو کہ تم سحر کی حقیقت و مضرت

پر مطلع ہو کر باز رہنے کے بجائے دوسروں کو اس سے ضرر پہونچانے لگو۔ اور کافر ہو جاؤ

(۳) فیتعلمون منھا من یہاں بدل و عوض کے معنی میں ہے جیسا کہ ان شعروں میں ہے

جمعت من الخیرات وطباو علیۃ ومن کل اخلاق الکرام نمیمۃ
ومن الاخلاف المزھمۃ البزلے وسعیا علی الجار المجاور بالمحل

شاعر کی مراد یہ ہے کہ تو نے اپنے نفس میں بجائے خیرات و اخلاق کریمہ کے یہ تمام خصائل ذمیمہ جمع کر رکھی ہیں۔ پس فیتعلمون منھا کا مفہوم یہ ہے کہ لوگ بجائے اس کے کہ فرشتوں کی تنبیہ و ممانعت (کہ ہم تمہارے لئے آزمائش بنا کر بھیجے گئے ہیں پس کفر میں مبتلا نہ ہونا) پر عمل کرتے سحر سیکھا کرتے تھے۔

اس واقعہ کی حقیقت اتنی ہی ہے کہ جو ظاہر کی گئی۔ اب اس کے بعد ہم ان اعتراضوں کو جو یہاں وارد کئے جاتے ہیں۔ معہ جواب درج کرتے ہیں۔

(پہلا اعتراض) سحر کفر و معصیت اور فعل عبث ہے لہٰذا خدا کے لئے کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ کسی انسان یا فرشتے پر اسے نازل کرے اور ان کے ذریعے سے بندوں کو اسکی تعلیم دے۔

(جواب) امر و نہی کے مطابق عمل کرنا اس فعل کی حقیقت معلوم ہو جانے پر موقوف ہے۔ جسکا حکم دیا جائے یا ممانعت کی جائے۔ اسی لئے معاصی اور اعمال قبیحہ کی حقیقت کو بھی بیان کر دینا ضروری ہوتا ہے تاکہ لوگ اس سے احتراز کر سکیں پس کسی شے کی حقیقت و صفت کے ظاہر کرنے کی یہی غرض نہیں ہوتی کہ لوگوں کو اس پر ترغیب دی جائے بلکہ کبھی مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس سے اجتناب کریں۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے۔

عرفت الشر لا للشر لکن لتوقیہ (یعنی شر کی معرفت ایجاد شر کے لئے نہیں ہے بلکہ اس سے بچنے کیلئے ہے)۔ نیز حقیقت سحر کو بیان کرنے کی ضرورت اس لئے بھی ہوتی ہے کہ لوگ سحر و معجزہ میں تمیز کر سکیں۔ اسی غرض سے علماء اسلام نے بھی اپنی کتابوں میں معجزہ کے ساتھ ساتھ سحر کی حقیقت سے بھی بحث کی ہے۔

(دوسرا اعتراض) خداوند عالم کا یہ قول لکن الشیاطین کفروا تعلیم سحر ہی کی وجہ سے خدا شیاطین کو کافر ٹھہراتا ہے۔ پس اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ملائکہ سحر سکھاتے تھے تو وہ بھی کافر ٹھہریں گے۔ (جواب) تعلیم سحر اس وقت کفر ہو گی جبکہ اس سے سحر کا حق ثابت کرنا اور لوگوں کو ساحری کی ترغیب دینا مقصود ہو۔ اور اگر مقصود یہ ہو کہ لوگوں پر اسکا بطلان ظاہر کر دیا جائے اور اس پر عمل کرنے کی

مانعت کی جائے تو ہرگز کفر و عبث نہ ہوگی۔ پس جبکہ فرشتے سحر کی حقیقت بتانے کے ساتھ ساتھ صاف طور سے یہ بھی کہہ دیا کرتے تھے۔ کہ ہم تمہارے لئے آزمائش بنکر آئے ہیں لہذا کفر سے بچتے رہنا۔ تو ان کے کافر قرار پانے کی کوئی وجہ نہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ ترجمہ:- (اے ایماندار و تم (رسول کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہو تو) راعنا (ہماری رعایت کر) نہ کہا کرو بلکہ انظرنا (ہم پر نظر توجہ رکھ) کہا کرو اور (جی لگا کر) سنتے رہو اور کافروں کیلئے دردناک عذاب ہے۔ (اے رسول) اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے کفر اختیار کیا وہ اور مشرکین یہ نہیں چاہتے کہ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے بھلائی (وحی) نازل کی جاوے۔ اور (ان کا تو اس میں کچھ اجارہ نہیں) خدا جسکو چاہتا ہے اپنی رحمت کے لئے خاص کر لیتا ہے۔ اور خدا بڑا فضل (کرنے) والا ہے (1)

(1) راع فعل امر مراعات کا ہے اور اس کے معنی کسی شے کے تحفظ و تدبر کے ہیں اور راعی چرواہے کو بھی کہتے ہیں۔ نیز "راعن" مشتق ہوتا ہے "رعونة" سے جس کے معنی حمق کے ہیں۔ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات بیان فرماتے اور مسلمانوں کی سمجھ میں نہ آتی تو راعنا کہا کرتے تھے۔ یعنی آپ دوسری بات کے بیان فرمانے میں ذرا توقف و انتظار کیجئے۔ تاکہ ہم اسکو سمجھ کر یاد کر لیں یہود نے مسلمانوں کو یہ کلمہ کہتے سنا تو ان کو موقع ملا۔ اور جس بات پر انکو رد کرنا مقصود ہوتا تھا یہی کلمہ کہکر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرنے لگے مگر اس معنی کا قصد نہیں کرتے تھے جو مسلمانوں کا مقصود ہوتا تھا بلکہ اس سے چرواہا یا احمق کہنا مقصود ہوتا تھا۔ لہذا پروردگار عالم نے اہل اسلام کو حکم دیا کہ بجائے راعنا کے انظرنا کہا کریں تاکہ آنحضرت کے دشمنوں کو کسی برے معنی کا قصد کرنے کا موقع بھی نہ ملے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ ترجمہ:- (اے رسول۔ ہم جب کوئی آیت منسوخ کرتے ہیں یا (تمہارے ذہن سے) مٹا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی اور نازل بھی کر دیتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ بے شبہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔)

(1) چونکہ بعض آیتوں کا فقط حکم منسوخ کیا جاتا تھا۔ اور بعض کی تلاوت بھی منسوخ کر دی جاتی تھی اس لئے ما ننسخ کہنے کے بعد او ننسھا بھی فرمایا۔ اور اس سے وہی آیتیں مقصود ہیں جو نسخ حکم کے ساتھ ان کی تلاوت بھی منسوخ کر دی جاتی تھیں در پھر رفتہ رفتہ لوگوں کو فراموش ہو جاتی تھیں۔

(2) نسخ کی بحث فی الجملہ بسط و تفصیل کو چاہتی ہے کیونکہ اسکے متعلق عقائد و آراء میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ لہذا ہم تمام ضروری باتوں کو مختلف مباحث میں تحریر کرتے ہیں

(مبحث اول) لغت عرب میں لفظ "نسخ" کے معنی ازالہ کے ہیں (یعنی زائل کرنا) محاورہ عام میں کہتے تھے نسخت الشمس الظل یعنی آفتاب نے سایہ کو زائل کیا۔ اور اہل شرائع کی اصطلاح میں اس لفظ کے معنی یہ ہیں جو حکم شرعی کسی زمانہ میں ثابت ہو اسکو دوسرے زمانے میں کوئی دوسرا حکم شرعی دے کر اٹھا دینا۔

قال الرازی النسخ عبارة عن طریق شرعی یدل علی ان الحکم الذی کان ثابتاً بطریق شرعی لا یوجد بعد ذالك مع تراخیه الخ

عموماً اس دوسرے حکم کو پہلے حکم کا ناسخ کہا جاتا ہے لیکن اس قول میں فی الجملہ مسامحہ سے کام لیا جاتا ہے کیونکہ جو حکم منسوخ ہوتا ہے اس کی مصلحت درحقیقت ایک خاص مدت کے اندر محدود ہوتی ہے دوسرے زمانہ میں باقی نہیں رہتی بس اس مدت معینہ کا ختم ہو جانا حکم اول کا حقیقی ناسخ ہوتا ہے لیکن چونکہ اس مدت معینہ اور مصلحت مخصوص کی انتہا عام طور سے نظر ظاہر میں معلوم نہیں ہوتی۔ اسلئے دوسرے حکم کو ناسخ کہتے ہیں۔

(مبحث دوم) شرائع الہیہ جن احکام پر مشتمل ہوتی ہیں انکی چھ قسمیں ہوتی ہیں۔

(1) اعتقادات ان کا تعلق پانچ امور سے ہوتا ہے (1) وجود و صفات حق تعالیٰ (2) وجود ملائکہ (3) کتب سماویہ (4) انبیاء و رسل کی حقیقت (5) معاد جسمانی اور عالم آخرت کا ثواب و عقاب۔ یہ تمام امور اس آیت میں یکجا مذکور ہیں۔

(2) عبادات مثلاً صوم و صلوٰۃ، خمس و زکوٰۃ وغیرہ

(3) مشتہیات یعنی وہ چیزیں جن کا انسان بقائے حیات و حفظ نسل کے لئے بحکم فطرت طالب ہوتا ہے۔

(4) معاملات یعنی خرید و فروخت۔ رہن و قرض وصایا و مواریث وغیرہ

(5) حدود و تعزیرات جو جان و مال۔ آبرو اور نسب کے تحفظ کیلئے ضروری ہوتی ہیں۔

(۶) وہ آداب و اخلاق جن سے نفس کی تہذیب اور تمدن و معاشرت کی اصلاح ہو سکتی ہے مثلاً علم۔ حلم۔ شجاعت۔ عفت۔ وفا۔ تواضع۔ تعظیم و اطاعت والدین۔ صلہ رحمی۔ نصرت مظلوم۔ اعانت فقراء وغیرہ

ان تمام اقسام مذکورہ میں سے دو بڑی قسمیں نسخ و تغیر کو قبول نہیں کرتیں لہٰذا ان کی بابت تمام شرایع الٰہیہ باہم کامل اتفاق رکھتے ہیں۔

(اول) اعتقادات ان میں نسخ نہ واقع ہو سکنے کا سبب یہ ہے کہ امور اعتقادیہ کے صفات و حالات واقعیہ میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ لہٰذا ان کی مطابق واقع معرفت حاصل کرنے کے احکام میں بھی تنسیخ و تغیر دخل نہیں پا سکتی۔

(دوم) آداب و اخلاق۔ ان میں نسخ اس لئے واقع نہیں ہو سکتا کہ خود عقل انسانی بھی ان کے حسن و قبح کا حکم کرتی ہے۔ اسی سبب سے وہ مستقلات عقلیہ کہے جاتے ہیں۔ اور شرایع الٰہیہ میں کوئی حکم ایسا وارد نہیں ہو سکتا جو حکم عقل کے خلاف ہو ورنہ شیطانی شریعتوں سے ان کا امتیاز غیر ممکن ہو گا۔

ان کے علاوہ باقی اقسام میں نسخ واقع ہو سکتا ہے۔ اور ان میں بھی اصول منسوخ نہیں ہو سکتے۔ محض ہیئات اور شکل اور کیفیت و مقدار میں نسخ و تبدیلی کیجا سکتی ہے، اس مطلب کو یوں سمجھنا چاہیئے کہ خداوند عالم کی طرف سے کوئی شریعت عالم میں ایسی جاری نہیں کیجا سکتی جس میں مطلقاً عبادات کا حکم موجود نہ ہو۔ معاملات میں عدل و انصاف کے قوانین معین نہ کئے گئے ہوں بندوں کی جان و مال۔ آبرو اور نسب کے تحفظ کیلئے حدود و تعزیرات کے اصول مذکور نہ ہوں ماکولات و ملبوسات نکاح و طلاق کے ضوابط کی طرف توجہ نہ کی گئی ہو۔ البتہ یہ جائز ہے کہ مکان زمان اور مکلفین کے حالات کے تبدل و تغیر کے اعتبار سے عبادات و معاملات حدود و تعزیرات کی ہیئت و کیفیت بدل دی جائے۔ اور مقدار میں کمی و زیادتی کر دیجائے اور بقائے نفس و حفظ نسب کے لوازم میں فی الجملہ تغیرات واقع کر دئے جائیں۔

(مبحث سوم) کوئی صحیح العقل انسان ان تین باتوں سے انکار نہیں کر سکتا۔ ایک یہ کہ خداوند عالم حکیم کامل الحکمۃ اور غنی مطلق ہے۔ لہٰذا اس کے افعال عبث و قبیح اور مصلحت و حکمت سے خالی نہیں ہو سکتے۔ اور تمام مصالح بندوں ہی سے متعلق ہوں گے خود ان کی ذات کو ان کی کوئی احتیاج نہ ہو گی۔

دوسرے یہ کہ مصلحت خداوند عالم کے بعض افعال کی صفت ذاتی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس سے کبھی جدا نہیں ہو سکتی اور اس لئے اس فعل کا ترک کسی وقت میں جائز نہیں ہو سکتا۔ مثلاً عدل و انصاف، وفائے وعدہ، قبول توبہ نادم صادق النیۃ وغیرہ جیسے افعال کبھی مصلحت سے خالی نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا انکا واقع نہ کرنا خداوند عالم کے لئے قبیح ہو گا اور کبھی مصلحت خدا کے بعض افعال کی عارضی صفت ہوتی ہے۔ لہٰذا اشخاص کے اختلاف یا زمانے کے تبدل سے وہ مصلحت بھی باقی نہیں رہتی۔ اور اس صورت میں اس فعل کا واقع کرنا قباحت سے خالی نہیں ہو سکتا۔ فرض کرو کہ ایک خطاکار بندہ زبان و دل سے نعمات الٰہی کا شکریہ ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتا اور اس کے نیک اعمال کا پلہ گناہوں کے پلے سے بھاری ہے تو اسکی خطاؤں کو باوجود قدرت عقاب معاف کر دینا سراسر مصلحت اور باعث نفع عظیم ہو گا۔ کیونکہ اس سے صفت رحم و کرم ظاہر ہو گی اور دوسرے بندوں کے دلوں میں اسکی محبت پیدا ہو گی۔ اطاعت کا شوق بڑھے گا مگر کسی کج دل و کافر نعمت شخص کی خطاؤں کو بخش دینا یقیناً ضرر عظیم پیدا کر دے گا۔ کیونکہ دوسروں کو خوف عقاب باقی نہ رہے گا۔ اور برے اعمال کیطرف پوری جرأت کے ساتھ مائل ہوں گے۔

تیسرے یہ کہ زمانہ کے تغیر کے ساتھ ساتھ بنی نوع انسان کے احوال اور اخلاق و عادات میں بھی تغیر پیدا ہوتا رہتا ہے مثلاً کبھی قوی ہوتے ہیں اور بھاری بوجھ کا تحمل کر سکتے ہیں۔ اور کبھی ضعیف و عاجز۔ کوئی قوم سخت دل ہوتی ہے جس کا مطیع ہونا آسان نہیں ہوتا۔ اور کوئی نرم دل جو سہولت سے اطاعت قبول کرتی ہے اور حلقۂ اطاعت میں داخل ہو جانے کے بعد بھی یکبارگی تمام فرائض کا بار ڈال دینا مناسب نہیں ہوتا۔ بلکہ مصلحت کا مقتضیٰ یہی ہوتا ہے کہ جس قدر رفتہ رفتہ مشق و عادت بڑھتی جائے اسی قدر تدریجاً فرائض بھی متعلق ہوتے رہیں۔

ان امور مذکورہ کو معلوم کرنے کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ تمام احکام شرعیہ کی غرض فقط یہ ہوتی ہے کہ بندوں کے نفوس میں طہارت و تہذیب حاصل ہو اور انکی اجتماعی اور تمدنی حالت میں کوئی خلل و بدنظمی پیدا ہونے نہ پائے اور چونکہ زمانہ کے تغیر سے اکثر ان کے احوال و مصالح بھی بدلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا تمام احکام شرعیہ کا ایک ہی حالت پر باقی رہنا خلاف مصلحت ہو گا۔ ایسی حالت میں مقتضائے حکمت فقط یہی ہو سکتا ہے کہ ان میں بھی تنسیخ و تبدیل ہوتی رہے بالجملہ جتنی شرایع الٰہیہ عالم میں جاری کی گئیں۔ وہ اپنے زمانے میں احوال مکلفین کے اعتبار سے ہر طرح مکمل ہوتی تھیں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی شریعت اپنے زمانہ کے مصالح کے لحاظ سے ناقص بھیجی گئی ہو

البتہ کبھی احوال انسانی کے تغیرات کے سبب دوسرے عہد کے اعتبار سے ناقص ٹھہرتی تھیں۔ لہذا ان میں تغیر و تنسیخ ضروری ہوتی تھی۔ منجملہ اسباب نسخ کے ایک سبب قوی یہ بھی ہے کہ جب لوگوں کی غفلت شعاری۔ طمع دنیا اور ایسے ہی دیگر آفات کیوجہ سے شریعت کے آثار بالکل مٹ جاتے ہیں یا اسکی شکل اتنی بدل جاتی ہے کہ طالب ہدایت کیلئے حق و باطل میں امتیاز کرنے کی صورت باقی نہیں رہتی تو اسوقت شریعتِ جدیدہ کا بھیجنا لازم ہوجاتا ہے چنانچہ جناب موسیٰ کے عہد سے پہلے شریعت ابراہیمی کے آثار بالکل مٹ چکے تھے اور جناب عیسیٰ کی بعثت سے پیشتر شریعت موسوی کا فقط نام ہی نام باقی تھا۔ اور عہد خاتم المرسلین سے پہلے شریعت عیسوی بالکل مٹ چکی تھی۔ جیسا کہ نامور عیسائی مصنف گاڈفری ہنگس اپنی کتاب اپالوجی میں لکھتے ہیں۔ اس وقت کے دین عیسوی کی حالت کے ذکر میں آکسفورڈ کے عالم واعظ کا یہ قول ہے۔ "اس کمبخت زمانہ میں عیسائیوں کے بہت خفیف اور بے ہودہ فرقے بیشمار جماعتوں میں منقسم ہوکر خود سری سے باہم نزاع اور کینہ سے ایک دوسرے کو ایذا رسانی کرنے لگے۔ رائے میں ناقص اور عمل میں خوار ہوگئے" ۔ اور اسوجہ سے یہ لوگ بجز نام اور ظاہری اقرار مذہبی کے اور کچھ نہ رکھتے تھے۔ نہایت خراب اصول اور بیہودہ رائیں عموماً جاری تھیں۔ ...... پھر وہ کہتا ہے دلیوں کی مورتیں جنھوں نے کہ مذہب کے مشتہر کرنے میں محنت کی تھی اور شہیدوں کی ہڈیاں جو اس کے استحکام میں مرے تھے۔ اس وقت پادریوں کی حکمت عملی اور وہمی لوگوں کی جہالت سے مذہبی پرستش کے لئے مناسب اشیاء قرار دی گئی تھیں۔ (منقول از حمایت الاسلام ترجمہ اپالوجی صد۲)

دفع دخل۔ ممکن ہے کہ میری اس تحریر سے کسی کو یہ خیال ہوجائے کہ جب احوال انسانی کے تغیرات نسخ شرائع کو لازم قرار دیتے ہیں تو کسی وقت میں شریعت اسلام کا منسوخ ہوجانا بھی ضروری ہوگا۔ بلکہ اسوقت بھی اس میں تبدیل و تنسیخ کی بہت کچھ ضرورت ہے کیونکہ جو حالت تمدن و معاشرت کی پہلے تھی وہ اب باقی نہیں رہی۔ لہذا یہاں یہ لکھ دینا بھی ضروری ہے کہ تغیر احوال کو سبب نسخ قرار دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر تغیر کے سبب سے نسخ شریعت لازم ہوجاتا ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ زمانہ کے تغیر و انقلاب سے کبھی کبھی کچھ مخصوص حالات ایسے پیدا ہوجاتے ہیں جو تنسیخ شریعت کو لازم کردیتے ہیں۔ مگر ان کی تشخیص و تعیین انسان کے احاطۂ علم سے باہر ہے۔ بجز خداوند عالم کے اور کسی کو صحیح طور سے معلوم نہیں ہوسکتا۔ کہ وہ کون کون سے حالات ہیں اور کتنی مدت میں حادث ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان حالات کے پیدا ہوجانے کے بعد احکام شرعیہ میں رد و بدل ضروری ہوجاتا ہے مگر خود ان حالات

مخصوصہ کا موجود ہونا بھی ضروری نہیں۔ ممکن ہے کہ صدہا سال گذر جانے کے بعد بھی انکا وجود نہ ہو۔ پس محض اخلاق و تمدن کے عام تغیرات کیوجہ سے شریعت اسلام میں نسخ کی ضرورت لاحق نہیں ہوسکتی

(مبحث چہارم) عہد عتیق و جدید کی کتابوں میں نسخ احکام شرائع سابقہ کی مثالیں بہ کثرت موجود ہیں ان میں چند یہاں نقل کیجاتی ہیں۔

شریعت نوح میں نسخ واقع ہونا

(۱) اور خداوند عالم نے نوح سے کہا کہ تو اپنے سب خاندان سمیت کشتی میں آ۔ کیونکہ میں نے تجھی کو اپنے حضور میں اس زمانہ کے درمیان صادق دیکھا ہے پاک جانداروں میں سے سات سات نر اور انکی مادہ اور ان میں سے جو پاک نہیں ہیں دو دو نر اور ان کی مادہ اپنے پاس لے۔ (تکوین ۷۔۲۔۳)

اس بیان میں پاک جانور سے مراد وہ ہیں جنکا کھانا اور قربانی کرنا جائز تھا۔ اور ناپاک ان جانوروں کو کہا ہے جنکا کھانا اور قربانی کرنا جائز نہ تھا۔ پھر دوسرے مقام پر یہ مذکور ہے "سب جیتے چلتے جانور تمہارے کھانے کے واسطے ہیں میں نے ان سب کو نباتات کے مانند تمہیں دیا" (تکوین ۹۔۳)

اس بیان میں ہر جانور کو ماکول اللحم قرار دیا۔ حلال اور حرام طاہر و غیر طاہر کی تفریق نہیں کی گئی ہے۔ لہذا دونوں شریعتوں سے لامحالہ ایک ناسخ اور دوسری منسوخ ہوگی۔ دونوں ایک ہی وقت میں قابل عمل نہیں ہوسکتیں۔

پھر یہ حکم تمام حیوانات کے ماکول اللحم ہونے کا توریت نے منسوخ کردیا اور بہت سے حیوانات حرام کردیئے۔ (دیکھو استثناء باب ۱۴)

شریعت ابراہیم میں نسخ

(۲) اور ابراہام بولا میں نے کہا کہ ہرگز خدا کا خوف یہاں نہیں ہے۔ اور وے میری جورو کے واسطے مجھ کو مار ڈالیں گے اور وہ تو سچ میری بہن ہے میرے باپ کی بیٹی۔ پر میری ماں کی بیٹی نہیں سو میری جورو ہوئی۔"

اس کلام سے معلوم ہوا کہ سارا جناب ابراہیم کی علاتی بہن تھیں اور اسوقت (نعوذ باللہ) اس طرح کا نکاح جائز تھا مگر شریعت موسیٰ نے اسکو منسوخ کردیا (دیکھو احبار ۱۸-۱۹)

(۳) توریہ کتاب تکوین میں مذکور ہے کہ راحیل ولیاہ دونوں حقیقی بہنیں ایک ہی وقت میں جناب یعقوب کی زوجہ تھیں اور اس سے ظاہر ہوا کہ اس وقت جمع بین الاختین جائز تھا۔ مگر توریت نے اسکو حرام کردیا (دیکھو احبار ۱۸-۱۸)

شریعت موسیٰ میں نسخ (۴) جو شریعت جبل سینا پر جناب موسیٰ کو دی گئی تھی اس میں بھائی کی زوجہ سے نکاح کرنا مطلقاً حرام کیا گیا تھا (دیکھو احبار ۱۸-۱۶)

مگر تقریباً چالیس سال کے بعد جو شریعت آپ کو یردن کے بیابان میں عطا ہوئی اس میں یہ حکم دیا گیا۔ اگر کئی بھائی ایک جا رہتے ہوں اور ایک ان میں سے بے اولاد مرجائے تو اس مرحوم کی جورو کا بیاہ کسی اجنبی سے نہ کیا جاوے بلکہ اس کے شوہر کا بھائی اس سے خلوت کرے اور اسے اپنی جورو کرلے (استثناء ۲۵-۵-۱۱)

(۵) توریت میں عورت کو کسی عیب کیوجہ سے طلاق دے دینے کی عام اجازت دی گئی تھی۔ اور وہ بعد طلاق کے دوسرے کی زوجہ بن سکتی تھی۔ (دیکھو استثناء ۲۴-۱-۴)

مگر جناب عیسیٰ نے یہ حکم اپنے اس ارشاد میں منسوخ کردیا۔ "یہ بھی لکھا گیا کہ جو کوئی اپنی جورو کو چھوڑ دے اسے طلاق نامہ لکھ دے پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی جورو کو زنا کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دیوے اس سے زنا کرواتا ہے۔ اور جو کوئی اس چھوڑی ہوئی سے بیاہ کرتا ہے زنا کرتا ہے (متی ۵-۳۲)

(۶) توریت میں سیاست و قصاص کے احکام کمال تاکید کے ساتھ دیئے گئے تھے۔ اور اس بارے میں نرمی و مہربانی کو دخل دینے کی ممانعت کی گئی تھی مگر اناجیل واحدہ میں جناب عیسیٰ کا قول منقول ہے "تم سن چکے ہو کہ کہا گیا آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ ظالم کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اسکی طرف پھیر دے" (متی ۵-۳۸-۴۲- لوقا ۶-۲۹)

(مبحث پنجم) نسخ کے لئے یہ لازم نہیں کہ جدید شریعت میں شریعت سابقہ کے احکام برطرف کردیے جائیں بلکہ اگر ان کو باقی رکھتے ہوئے حسب ضرورت زمانہ نئے احکام جاری کئے جائیں تو سب کا مجموعہ ایک جدید شریعت بن جائے گا۔ جس کے اعتبار سے اگلی شریعت اس لئے منسوخ قرار پائیگی کہ اسکے احکام اب دوسری شریعت کے احکام بن گئے۔ اور اسکا وجود کسی مستقل شریعت کی حیثیت سے باقی نہ رہا۔"

أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ○ أَمْ تُرِيدُونَ أَنْ تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوسٰى مِنْ قَبْلُ ۗ وَمَنْ يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ

ترجمہ:- (کیا تم نہیں جانتے کہ آسمان و زمین کی حکومت بلاشبہ خدا ہی کیلئے ہے اور خدا کے سوا نہ تمہارا کوئی سرپرست ہے اور نہ مددگار (مسلمانو!) کیا تم چاہتے ہو کہ تم بھی اپنے رسول سے ویسی ہی باتیں (بیڈھنگے سوالات) کرو جس طرح سابق زمانہ میں موسیٰ سے (بے تکے) سوالات کئے گئے تھے اور جس شخص نے ایمان کے بدلے کفر اختیار کیا وہ یقیناً سیدھے رستہ سے بھٹک گیا۔"

(۱) یہ آیت ماسبق آیت سے مربوط ہے۔

(۲) آسمان و زمین کی حکومت پر اپنا اختیار کامل بیان کرکے قدرت یہ ثابت کررہی ہے کہ ہر شے کے مصالح اور ان کی تدبیر کا ہمیں علم ہے لہٰذا ہم اپنے علم کے مطابق نسخ واقع کرتے ہیں

(۳) اس آیت میں قدرت نے یہ بھی ظاہر کردیا ہے کہ اور کسی کو ہمارے احکام کے منسوخ کرنے کا حق نہیں کیونکہ تمہارے مفاد کو دوسرے سمجھ ہی نہیں سکتے۔ لہٰذا کسی اور کو اپنا سرپرست یا مددگار نہ بنانا اور نہ اپنے نفس کے ورغلانے سے ہمارے رسول سے بیجا فرمائش کرنا

وَدَّ كَثِيرٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتّٰى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ○ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ ۚ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ○ ترجمہ "مسلمانو! اہل کتاب میں سے اکثر لوگ اپنے دلی حسد کیوجہ سے یہ خواہش رکھتے ہیں کہ کاش وہ تم کو ایمان لانے کے بعد پھر کافر بنا دیں۔ بعد اسکے کہ ان پر حق واضح ہوچکا ہے پس تم معاف کردو اور درگذر کرو یہاں تک کہ خدا اپنا کوئی اور حکم بھیجے۔ بیشک خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ اور نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے جاؤ اور جو کچھ بھلائی اپنے لئے خدا کے یہاں پہلے سے بھیجدوگے اسکو خدا کے پاس موجود پاؤ گے۔ جو کچھ تم کرتے ہو خدا اسے ضرور دیکھ رہا ہے۔"

(۱) اس آیت میں اہل کتاب کے دلی جذبات کی قدرت نے ترجمانی کی ہے کہ معجزات و دلائل کے دیکھنے کے بعد بھی وہ تمکو محض حسد کی بنا پر حق سے ہٹانے کیلئے ساعی ہیں لیکن تم کو ان سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے تم انھیں معاف کردو اور اپنے کو نیک کردار بناتے رہو اسکا فائدہ یہ ہوگا کہ تمہاری نیک کرداری اور ان کے ساتھ خوش رفتاری انھیں بھی راہ راست کیطرف متوجہ کردے گی

(۲) اس آیت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اچھا عمل خدا کے پاس ذخیرہ رہتا ہے۔ اور بعینہ وہی آخرت میں جزا بن جائے گا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ بلکہ اچھے عمل کا ثواب آخرت میں ملے گا۔ اس کی تحقیق کسی اور مناسب محل پر پیش کی جائے گی۔

وَقَالُوا لَن يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِندَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ ۗ كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ

ترجمہ:- (اور یہود) کہتے ہیں کہ یہودیوں کے سوا اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ نصرانیوں کے سوا کوئی بہشت میں جانے ہی نہ پائے گا۔ یہ ان کے خیالی پلاؤ ہیں۔ اے رسول تم ان سے کہدو کہ اگر تم سچے ہو کہ ہم ہی بہشت میں جائیں گے تو اپنی دلیل پیش کرو۔ ہاں بیشک جس شخص نے خدا کے آگے اپنا سر جھکا دیا اور اچھے کام بھی کرتا ہے تو اس کے لئے اسکے پروردگار کے یہاں اسکا بدلہ موجود ہے اور آخرت میں ایسے لوگوں پر نہ کسیطرح کا خوف ہوگا اور نہ ایسے لوگ غمگین ہوں گے۔ اور یہود کہتے ہیں کہ نصاریٰ کا مذہب کچھ ٹھیک نہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود کا مذہب کچھ ٹھیک نہیں حالانکہ یہ دونوں فریق کتاب خدا پڑھتے رہتے ہیں اسی طرح انھیں کی سی باتیں وہ (مشرکین عرب) بھی کیا کرتے ہیں جو (خدا کے احکام) کچھ نہیں جانتے تو جس بات میں یہ لوگ جھگڑ رہے ہیں قیامت کے دن خدا اسکا ٹھیک فیصلہ کر دے گا

(۱) ان آیات میں خداوند عالم نے پہلے یہود و نصاریٰ کے بلا دلیل دعوؤں کو یہ کہہ کر خارج کر دیا کہ اگر تم سچے ہو تو دلیل لاؤ بظاہر مطلب یہ ہے کہ نہ تو کسی مذہب کے مان لینے سے اس کے سب ماننے والے جنت میں نہیں چلے جائیں گے اور نہ کسی مذہب کا فقط زبانی اقرار دخول جنت کا موجب ہے۔

(۲) یہود و نصاریٰ کے دعوؤں کو رد کرنے کے بعد خداوند کریم نے جنت میں داخل ہونے کا ایک معیار پیش کر دیا ہے۔ اور وہ ہے اسلام اور احسان۔ خواہ اسکو لغوی حیثیت سے دیکھا جائے یا اصطلاحی حیثیت سے۔ بہر طور جنت میں جانے کیلئے عقیدہ توحید وغیرہ اور اعمال حسنہ

سے متصف ہونا ضروری ہے۔

(۳) پھر یہود و نصاریٰ کی باہمی آویزش اور ہر ایک کا دوسرے کے مذہب کو بے حقیقت قرار دینا نیز مشرکین عرب کا بھی انھیں لوگوں کے ہم آہنگ ہو جانا یہ خود بتاتا ہے کہ یہ لوگ صرف عصبیت کا شکار ہیں۔ اور حق طلبی سے بالکل بیزار ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسطرح کا جھگڑا اس دنیا میں خدا بھی نہیں چکا سکتا۔ (تاکہ جبر کا الزام نہ عائد ہو) اس لئے اس نے قیامت پر اسکا فیصلہ اٹھا رکھا ہے

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللَّهِ أَن يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا ۚ أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَن يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ ۚ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝

ترجمہ:- اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو خدا کی مسجدوں میں اس کا نام لئے جانے سے (لوگوں کو) روکے۔ اور ان کی بربادی کے درپے ہو۔ ایسے ہی لوگوں کو حق نہیں ہے کہ اس میں جائیں۔ مگر سہمے ہوئے ایسے ہی لوگوں کیلئے دنیا میں رسوائی ہے اور ایسے ہی لوگوں کیلئے آخرت میں بڑا بھاری عذاب ہے۔(۱)

ہجرت کے ساتویں برس رسولخدا صلعم نے مدینہ سے حج کے ارادہ سے مکہ کا سفر کیا مگر کفار نے جانے نہ دیا۔ پس اس آیت میں اسی واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور اولٰئک ما کان لھم ان یدخلوھا الا خائفین" الخ فرما کر خدا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بشارت دی کہ وہ عنقریب مکہ و مسجد الحرام پر قابض ہو جائیں گے۔ اور کفار کو وہاں بے خوف داخل ہونا ممکن نہ ہوگا۔ چنانچہ یہ پیشگوئی پوری ہوئی۔"

وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝ تمہارے مسجد میں روکنے سے کیا ہوتا ہے کیونکہ ساری (زمین) خدا ہی کی ہے (کیا) پورب (کیا) پچھم۔ پس جہاں کہیں (قبلہ کیطرف) رخ کر لو۔ وہیں خدا کا سامنا ہے۔ بیشک خدا بڑی گنجائش والا ہے۔ اور خوب واقف ہے)

(۱) جب اسلام کیلئے قبلہ بیت المقدس کے بجائے کعبہ مقرر ہو گیا تو یہود طعن و تشنیع کے کلمات کہنے لگے پس ان کی باتوں کی رد کیلئے خدا نے یہ آیت نازل کی اور بتایا کہ قبلہ ہونا مشرق و مغرب (یا کسی اور جہت) کی ذاتی صفت نہیں ہے بلکہ جس سمت کو خدا چاہتا ہے قبلہ بنا دیتا ہے۔ جسطرح اس نے بیت المقدس کو پہلے قبلہ مقرر کیا تھا اسی طرح اب کعبہ کو بنا دیا۔ اس میں انکار اور طعن و تشنیع کی کوئی وجہ نہیں۔

(۲) وجہ کے معنی "قصد" کے ہیں۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے۔

استغفر اللہ ذنبا لست احصیہ رب العباد الیہ الوجہ والعمل

یعنی میں خدا سے جو تمام بندوں کا پروردگار ہے جس کی طرف قصد و عمل دونوں کا رخ ہے۔ ان گناہوں کی معافی مانگتا ہوں۔ جن کو میں شمار بھی نہیں کر سکتا۔

پس محصل آیت یہ ہوا کہ مشرق و مغرب دونوں کا مالک و خالق خدا ہے۔ لہٰذا تم جدھر بھی اسکے قصد سے رخ کرو گے تمہارا قصد صحیح ہوگا۔

(۳) یہ آیت دو وجہوں سے ظاہر کرتی ہے کہ خداوند عالم جہت اور جسمیہ سے منزہ ہے۔

(پہلی وجہ) وہ تمام جہات کا خالق ہے اور اسوقت بھی موجود تھا جبکہ کوئی جہت عالم وجود میں آئی تھی

(دوسری وجہ) اگر وہ جسم و جسمانی ہوتا تو لا محالہ کسی مخصوص جہت میں ہوتا کیونکہ جسم کسی خاص جہت و چیز کا طبعاً طالب ہوتا ہے۔ تمام جہات اور مختلف چیزوں کا طالب نہیں ہو سکتا پس جبکہ اس کے لئے کوئی جہت مخصوص نہیں تو جسم و جسمانی بھی نہیں ہو سکتا۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۝ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ ترجمہ (اور یہ لوگ) کہنے لگے کہ خدا اولاد رکھتا ہے حالانکہ وہ اس (بکھیڑے) سے پاک ہے۔ بلکہ جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے اور سب اسی کے فرمانبردار ہیں۔ وہی آسمان اور زمین کا موجد ہے اور جب کسی کام کا کرنا ٹھان لیتا ہے تو اس کی نسبت صرف کہدیتا ہے کہ ہوجا پس وہ خود بخود ہوجاتا ہے۔"

اس آیت میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین کی رد کی گئی ہے کیونکہ ان میں سے کوئی عزیر کو خدا کا بیٹا بتلاتا تھا۔ اور کوئی عیسیٰ کو اور کوئی ملائکہ کو خدا کی اولاد سمجھتا تھا۔ پروردگار عالم نے آیۂ زیر بحث کے علاوہ اور متعدد آیات میں اس عقیدہ باطلہ کی رد کی ہے ان میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحٰنَهٗ اِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ یعنی خدا کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ اپنے لئے کوئی بیٹا تجویز کرے۔ اسکی ذات اس سے منزہ ہے اور جب کسی چیز کو ایجاد کرتا ہے تو کُن (ہوجا) کہتا ہے پس وہ چیز ہوجاتی ہے۔"

(۲) وقالوا اتخذ الرحمٰن ولدا لقد جئتم شیئا ادا تکاد السمٰوٰت یتفطرن منہ و یعنی (یہودی) کہتے ہیں کہ خدا نے (عزیر کو) بیٹا بنالیا ہے (اے رسول) تم کہدو کہ تم نے اتنی بڑی سخت بات (اپنی

وتنشق الارض وتخر الجبال ھدا ان دعوا للرحمٰن ولدا وما ینبغی للرحمٰن ان یتخذ ولدا ان کل من فی السمٰوٰت والارض الا آتی الرحمٰن عبدا (مریم)

طرف سے گڑھ کے، کبھی ہے کہ قریب ہے کہ آسمان اس سے پھٹ پڑیں اور زمین شگافتہ ہوجائے اور پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑیں۔ اس بات سے کہ ان لوگوں نے خدا کے لئے بیٹا قرار دیا حالانکہ خدا کے لئے یہ کسی طرح شایان نہیں کہ وہ (کسی کو اپنا) بیٹا بنائے سارے زمین و آسمان میں جتنی چیزیں ہیں سب کی سب خدا کے سامنے بندہ ہی بن کر آنے والی ہیں۔"

ان آیات میں کئی دلیلیں بیان کی گئی ہیں جن سے عقیدۂ مذکورہ کا بطلان ظاہر ہوتا ہے:۔

(پہلی دلیل) صاحب اولاد ہونا شان الوہیت کے خلاف ہے۔ اولاً اس لئے کہ جسمیۃ اور زوجہ کی احتیاج لازم ہوگی۔ اور یہ دونوں باتیں قدم اور وجوب وجود کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔ ثانیاً بیٹا باپ کا ہمجنس ہوتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو ابوۃ و بنوۃ کا تعلق پایا ہی نہیں جا سکتا۔ اور جنس میں مشارکت کیساتھ کسی ایسے امر کا ان کی ذات میں موجود ہونا لازم ہوتا ہے۔ جو ہر ایک کو دوسرے سے ممتاز کرتا ہو۔ پس اگر خداوند عالم کیلئے کوئی ولد فرض کیا جائے تو اسکا مرکب و محتاج ہونا لازم آئے گا اور یہ دونوں باتیں صفت قدم و ازلیہ کے منافی ہیں۔

(دوسری دلیل) عالم کی تمام چیزیں خداوند عالم کی ملکیت ہیں وہ جسطرح چاہتا ہے ان میں تصرف کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ بیٹا باپ کا مملوک و عبد نہیں ہوتا اذا قضیٰ امراً فانما یقول لہ کن فیکون اس آیت کا مقصود یہ نہیں ہے کہ خداوند عالم کو کسی شے کے خلق کرنے میں لفظ کن کہنے کی حاجت ہوتی ہے۔ اور وہ بعد اس کلمہ کے کہے جانے کے عالم وجود میں آتی ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ خدا تعالیٰ جس امر کا ارادہ کرتا ہے اسکے موجود کرنے میں اسکو فکر و غور یا حرکت اعضاء و جوارح کی ضرورت نہیں پڑتی اور اس شے کے موجود ہونے میں کسی سبب سے تاخیر نہیں ہوئی اس کا ارادہ اور ایسے شے کا بدون تاخیر موجود ہوجانا ایسا ہی ہے جیسے کن کہا جائے اور وہ موجود ہوجائے پس آیت میں خداوند عالم نے اپنے ارادہ اور شے کے بے تاخیر موجود ہوجانے سے مثال دی ہے اور بتایا ہے کہ اس کی قدرت اشیاء کے موجود ہوجانے میں کسقدر جلد اثر کرتی ہے۔

جناب امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے اس قول کن کی بابت فرمایا ہے "لا بصوت یقرع ولا بنداء یسمع وانما کلامہ سبحانہ فعل منہ وانشاء" یعنی نہ کوئی قابل صدا آواز ہے اور نہ کوئی لائق سماعت ندا، بلکہ اس کا کلام صرف اسکا فعل و ایجاد ہے۔

اور جناب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے مروی ہے یقول لہٗ کن فیکون بلا لفظ ولا نطق بلسان ولا تفکر ولا کیف لذالک کما انہ لا کیف لہ یعنی وہ کن کہتا ہے تو لفظوں میں نہیں اور نہ زبان سے بولتا ہے اور غور و فکر کرتا ہے اور نہ اس کن کیلئے کوئی کیفیت ہے جیسے کہ خود اس کے لئے کوئی کیفیت نہیں ہے۔

نیز ایک روایت میں ہے کن منہ صنع وما یکون بہ ھو المصنوع یعنی خداوند عالم کا قول "کن" بعینہٖ فعل ہے۔ دونوں میں کچھ فرق نہیں ایسا نہیں ہوتا کہ پہلے کن کہتا ہو اور پھر شے کو موجود کرتا ہو۔

اس امر کا ثبوت کہ قول کا اطلاق وہاں بھی ہوتا ہے جہاں کوئی آواز پائی نہیں جا سکتی۔ کلام عرب میں بکثرت مل سکتا ہے۔ چنانچہ ایک شاعر عرب کہتا ہے۔

فاصبحت مثل النسر طارت فراخہ   اذا رام تطیارا یقال لہٗ قع

شاعر نے اس شعر میں دل کے اضطراب و جذب کو قائل کہنے والا فرض کیا اور اسکی طرف قول کی نسبت دی ہے نیز دوسرے شاعر نے کہا ہے

ع وقالت لہ العینان سمعا وطاعۃ

اس مصرع میں آنکھوں کو قائل قرار دیا ہے اور انکی خاص حرکت و کیفیت کو قول سے تعبیر کیا ہے

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ترجمہ (اور جو کچھ نہیں جانتے ہیں کہتے ہیں کہ خدا ہم سے (خود) کلام کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس (خود) کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔ اسیطرح انھیں کی سی باتیں وہ لوگ کر چکے ہیں جو ان سے پہلے تھے ان سب کے دل آپس میں ملتے جلتے ہیں جو لوگ یقین رکھتے ہیں ان کو تو اپنی نشانیاں ہم صاف طور پر دکھا چکے۔ (اے رسول) ہم نے تم کو دین حق کے ساتھ (بہشت کی) خوشخبری دینے والا اور (عذاب سے) ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اور دوزخیوں کے بارے میں تم سے کچھ نہیں پوچھا جائے گا۔")

(۱) یہ نہ جاننے والے دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک تو مشرکین مکہ دوسرے وہ اہل کتاب

جنکا عمل مطابق علم نہ تھا۔

(۲) یہ فرمائشیں انوکھی نہیں ہیں بلکہ ان کے قبل والے بھی ایسے ہی بے تکی باتیں کر چکے ہیں مثلاً موسیٰ سے فرمائش کر بیٹھے تھے کہ ہمیں خدا کو کھلم کھلا دکھا دیجئے۔ یا آپ کا خدا ہم پر آسمان سے دسترخوان (طعام) نازل کر سکتا ہے؟

(۳) تشابھت قلوبھم کا مطلب یہ ہے کہ خیالات اور تصورات میں اور بے بصیرتی اور عناد میں یہ پچھلے لوگ اپنے پیشرؤں کے ہم طریق ہیں۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِىْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ ترجمہ (اے رسول) نہ تو یہودی کبھی تم سے رضامند ہوں گے اور نہ نصرانی۔ یہانتک کہ تم ان کے مذہب کی پیروی کرو (ان سے) کہدو کہ بس خدا ہی کی ہدایت تو ہدایت ہے (باقی ڈھکوسلا ہے) اگر تم اس کے بعد بھی کہ تمہارے پاس علم (قرآن) آچکا ہے انکی خواہشوں پر چلو گے تو تم کو خدا کے غضب سے بچانے والا نہ کوئی سرپرست ہوگا نہ مددگار۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب (قرآن) دی ہے وہ اسے پڑھتے رہتے ہیں جو پڑھنے کا حق ہے۔ یہی لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اس سے انکار کرتے ہیں وہی لوگ گھاٹے میں ہیں۔")

(۱) اس آیت میں خدا نے اپنے نبی کو یہود و نصاریٰ کے مسلمان نہ ہونے کی صاف صاف خبر دے دی ہے کہ وہ جب خود یہ خواہش رکھتے ہیں کہ تم ان کی ملت میں داخل ہو جاؤ تو بھلا وہ تمہاری ملت میں کب داخل ہوں گے۔

(۲) ھدی اللہ سے مراد اسلام ہے جسکی طرف پیغمبر دعوت دے رہے ہیں نہ کہ جدھر وہ بلا رہے ہیں۔

(۳) دھمکی بظاہر پیغمبر کو دی گئی ہے لیکن سنانا دوسروں کو ہے۔ جیسا کہ ہر زبان میں اس طرح کا انداز گفتگو پایا جاتا ہے۔

(۴) قرآن کا حق تلاوت یہ ہے کہ اسکے مطلب پر غور کرے اور جہاں جنت کا ذکر ہو تو اپنے لئے

اسکا خدا سے سوال کریں۔ اور جہاں جہنم کا ذکر ہو تو خدا کی بارگاہ میں اس سے پناہ مانگے وهکذا

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ۝ وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ

ترجمہ:- (اے بنی اسرائیل میری ان نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تمکو دی ہیں اور یہ کہ میں نے تم کو سارے جہاں پر فضیلت دی اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی شخص کسی کی طرف سے نہ ذریعہ ہو سکے گا اور نہ اسکی طرف سے کوئی معاوضہ قبول کیا جائے گا اور نہ کوئی سفارش ہی فائدہ پہونچائے گی اور نہ ان کی مدد کیجائیگی"۔

ان دونوں آیتوں کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ (اے رسول بنی اسرائیل کو وہ وقت بھی یاد دلاؤ) جب ابراہیم کو ان کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور انھوں نے پورا کر دیا تو خدا نے فرمایا کہ تم کو لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں (حضرت ابراہیم نے) عرض کی اور میری اولاد میں سے؟ فرمایا (ہاں مگر) میرے اس عہدے پر ظالموں میں کوئی شخص فائز نہیں ہوگا۔

(۱) ابتلیٰ کے لغوی معنی ہیں جانچنا اور امتحان کرنا۔ عام طور سے تو امتحان و آزمائش کی غرض یہی ہوتی ہے کہ کسی شے کی نامعلوم حقیقت پر اطلاع حاصل کی جائے لیکن کبھی باوجود حقیقت پر مطلع ہونے کی بھی مختلف وجوہ واغراض سے آزمائش کی جاتی ہے۔

(پہلی غرض) یہ ہوتی ہے کہ کسی شخص کا عجز وجہل خود اسی پر ظاہر کر دیا جائے اور اس آزمائش کی ضرورت اسوقت ہوا کرتی ہے جبکہ کسی شخص نے اپنی حیثیت سے زیادہ دعویٰ کیا ہو اس کی مثال فرشتوں کا وہ امتحان ہے جسکا قصہ مذکور ہو چکا۔

(دوسری غرض) جب کسی شخص کو کوئی بلند مرتبہ و منصب دینا ہوتا ہے تو دوسروں پر آزمائش کے ذریعہ اسکی استعداد و قابلیت ظاہر کر دی جاتی ہے تاکہ ان کو بے وجہ تفضیل و ترجیح کا شبہ نہ ہو سکے۔ انبیاء اور ائمہ کی آزمائش کا بڑا مقصد یہی تھا کہ ان کا استحقاق نبوت و امامت خلق پر واضح ہو جائے ---"

علاوہ اس کے اہل عالم کا طریقہ یہی تھا کہ امر و نہی سے آزمائش کا قصد کرتے تھے۔ اس لئے عرف عام کے مطابق خداوند عالم نے اپنے احکام تکلیفیہ کو بھی مجازاً بلا و ابتلاء سے تعبیر فرمایا ہے اور چونکہ کلام الٰہی محاورۂ عام کے مطابق نازل کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس قسم کے مجاز میں کسی طرح کے شبہ کی گنجائش نہیں۔

(۲) جن باتوں میں جناب ابراہیم کی آزمائش کی گئی تھی وہ یہ ہیں۔

(۱) خداوند عالم کی وحدت اور دیگر صفات کمال کی معرفت۔ اور اس کا ظہور اس وقت ہوا تھا جبکہ آپ نے چاند اور سورج اور ستاروں پر نظر کر کے اپنی قوم پر احتجاج کیا تھا یہ واقعہ آئندہ آئیگا

(۲) شجاعت۔ اور اسکا ثبوت واقعہ بت شکنی سے ملتا ہے جو سورۂ انبیاء میں مفصل طور سے مذکور ہے۔

(۳) حلم۔ یہ صفت اس آیت میں مذکور ہے اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیْبٌ۔

(۴) جود و سخا۔ اسکا ثبوت واقعہ مہمان نوازی سے ملتا ہے جو سورہ ذاریات میں بیان کیا گیا ہے۔

(۵) انقطاع الی اللہ اور کفار سے برات۔ اور یہ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے۔ وَاَعْتَزِلُکُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

(۶) امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ جسکا بیان اس آیت میں ہے یٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا یَسْمَعُ وَلَا یُبْصِرُ

(۷) توکل۔ اور وہ ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ۝ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ۝ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ۝

(۸) برائی کا جواب نیکی سے دینا۔ اسکا ثبوت اس آیت سے ملتا ہے قال اراغب انت عن الھتی یا ابراھیم لئن لم تنتہ لارجمنک واھجرنی ملیا قال سلٰم علیک ساستغفر لک ربی انہ کان بی حفیا

(۹) اسلام و اطاعت۔ اور وہ اس آیت سے واضح ہے ما کان ابراھیم یھودیا ولا نصرانیا الخ

(۱۰) محبت خدا میں اپنی جان دینا
(۱۱) حکم خدا کی تعمیل میں اپنے فرزند اسمٰعیل کو ذبح کرنا
} ان دونوں باتوں کا تفصیلی ذکر قرآن مجید میں موجود ہے جو آئندہ آئیگا۔

(۳) یہ آیت ظاہر کر رہی ہے کہ جب جناب ابراہیم امتحان الٰہی میں ثبات و استقلال کے

مدارج عالیہ طے کر چکے تو منصب امامت سپرد کیا گیا۔ لہٰذا امامت سے نبوت مراد نہیں ہے کیونکہ وہ آپکو پہلے ہی مل چکی تھی۔ اس سے قبل یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ نبوت و امامت دونوں منصب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ہر نبی کا امام ہونا لازم نہیں اور نہ ہر امام کا نبی ہونا ضروری ہے۔ بلکہ ہر ایک کے فرائض جداگانہ ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

(فرائض رسالت و نبوت) تبلیغ احکام الٰہی۔ ہدایت خلق۔ تشریع شریعت۔ تفصیل حلال و حرام

(فرائض امامت) تابعین سے بیعت لینا۔ تحصیل خراج و جزیہ۔ ترتیب فوج۔ دشمنوں سے جہاد و صلح کرنا۔ حوزہ دین کا تحفظ۔ حدود و تعزیرات کو جاری کرنا۔ البتہ امام کے معنی کبھی محض مقتدا کے بھی ہوتے ہیں۔ اور اس معنی سے تمام انبیاء امام بھی ہوتے ہیں اور ان کی پیروی واجب ہوتی ہے۔ چونکہ اس معنی سے امامت نبوت کے ساتھ لازم نبوت ہے لہٰذا جناب ابراہیمؑ کو پہلے ہی عطا ہو چکی تھی۔ بعد ابتلاء جو امامت دی گئی وہ بمعنی خاص یعنی ریاست عامہ و تولیۃ امور خلق تھی جو چند انبیاء کے سوا اور کسی کو نہیں دی گئی۔

نصب امام خدا کے ذمہ ہے

جبکہ ثابت ہوا کہ نبوت و امامت دونوں علیحدہ علیحدہ منصب ہیں اور جناب ابراہیم کو بعد ابتلا منصب امامت و ریاست عامہ ہی عطا ہوا تھا تو اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اس منصب پر کسی کو معین کرنا فقط خداوند عالم کے اختیار میں ہے۔ بشر کے اختیار سے باہر ہے جب تک خداوند عالم خود کسی کو منتخب فرما کر اس کی امامت پر نص نہ فرمائے۔ محض انسان کے اختیار و انتخاب سے امام نہیں بن سکتا۔ اور یہ اس بنا پر کہ جناب ابراہیم نے خدا سے سوال کیا کہ انکی ذریت میں سے بھی امام بنائے۔ اگر نصب امام کا آپ کو اختیار حاصل ہوتا یا عامہ ناس کے اختیار سے امامت حاصل ہو سکتی تو اس سوال کی حاجت کیوں ہوتی؟ یہ سوال اسکا کافی ثبوت ہے کہ امامت کا عطا کرنا بجز خدا کے اور کسی کے اختیار میں نہیں۔ علاوہ اس کے خداوند عالم نے امامت کو اپنا عہد قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا عہد اسی کے دینے سے مل سکتا ہے۔ انسان خود اپنے اختیار سے نہ حاصل کر سکتا ہے اور نہ دوسرے کو دے سکتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بجائے "لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ" کہنے کے یہ جواب ابراہیم کو دیتا کہ امامت میرے اختیار و نص پر موقوف نہیں ہے بلکہ اس کا اختیار میں نے تم کو اور تمام انسانوں کو دیدیا ہے پس جس کو چاہیو اپنے اختیار سے امام بنا دو۔

(۴) پروردگار عالم کا یہ جواب کہ "میرا عہد ظالمین کو نہیں مل سکتا" یہ ثابت کر رہا ہے کہ امامت کیلئے

عصمت لازم ہے اس کے سمجھنے کے لئے پہلے چند امور کو معلوم کر لینا چاہیے۔

(امر اول) آیات قرآنی میں "ظلم" کا اطلاق شرک و کفر اور ہر طرح کے معاصی پر بھی کیا گیا ہے۔ ان میں سے چند آیتیں یہ ہیں:-

(۱) اِن الشرک لظلم عظیم

(۲) والکافرون هم الظالمون

(۳) لکم رؤس اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون

یہ آیت سود خواری کو ظلم ٹھہراتی ہے۔ نیز اصل مال میں کمی کو بھی ظلم قرار دیتی ہے۔ حالانکہ ان دونوں باتوں کا کفر نہ ہونا باجماع امت ثابت ہے۔

(۴) منها اربعة حرم ذالك الدين القيم فلا تظلموا فيهن انفسكم

اس آیت میں چار محرم مہینوں میں حرب و قتال کو ظلم قرار دیا ہے۔ حالانکہ وہ بالاتفاق کفر نہیں۔ نیز حدیث صادق میں وارد ہے کہ من عبد صنماً او وثناً لا یکون اماماً (بتوں کی عبادت کرنے والا امام نہیں ہوگا)۔

(امر ثانی) ظالم کا اطلاق جسطرح اس شخص پر کیا جاتا ہے جو زمانہ حال میں ظلم کر رہا ہو۔ اسی طرح اس شخص کو بھی ظالم کہہ سکتے ہیں جو پہلے ظلم کرتا رہا ہو۔ یا آئندہ کرنے والا ہو اس لئے کہ کسی پر لفظ مشتق کا اطلاق کرنے کے لئے اس کے مبتدا پر مصدر کا بالفعل قائم ہونا لازم نہیں جیساکہ کتب قواعد عربیہ سے معلوم ہو سکتا ہے۔

(امر ثالث) یہ فرض کرنا بالکل خلاف عقل ہے کہ جناب ابراہیم نے ان لوگوں کے لئے عہد امامت کا سوال کیا ہو گا۔ جو فسق و ظلم میں مبتلا ہوں۔ ظلم و معصیت میں مبتلا رہنے کی حالت میں کسی کا مستحق عہد امامت نہ ہونا اتنا واضح ہے کہ اس کے لئے عہد الٰہی کے طلب کی جرأت بجز فاتر العقل کسی دوسرے کو نہیں ہو سکتی۔ پس لامحالا یہ ماننا پڑے گا کہ خلیل اللہ نے صرف انھیں لوگوں کے لئے سوال کیا تھا جو مبتلائے ظلم و معصیت نہ رہتے ہوں۔

ان باتوں کو معلوم کر لینے کے بعد ہر بافہم یہ سمجھ سکتا ہے کہ پروردگار عالم کے جواب کا محصل یہی ہے کہ جو لوگ اول عمر سے آخر عمر تک کی مدت میں کسی وقت بھی ظالم و عاصی ہونگے۔ ان کو امامت کا حق حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کے مستحق وہی لوگ ہونگے جو عمر میں کسی وقت ظلم و معصیت میں مبتلا نہ ہوئے ہوں۔ اور عصمت کے یہی معنی ہیں۔

امام رازی کا اعتراف

اس جواب کا دلیل عصمت ہونا فخر الدین رازی نے بھی تفسیر کبیر میں

تسلیم کیا ہے۔ ان کا کلام یہ ہے:۔

اما الشیعة فیستدلون بهذه الآیة علیٰ صحة قولهم فی وجوب العصمة ظاهراً وباطناً واما نحن نقول مقتضی الآیة ذالك الا انا ترکنا اعتبار الباطن فتبقی العدالة الظاہرة معتبرة۔

لیکن یہ شیعہ حضرات تو وہ اس آیت کے ذریعہ اپنے اس قول کو ثابت کرتے ہیں کہ ظاہراً اور باطناً (ہر طرح) عصمت واجب ہے۔ اور ہم یہ کہتے ہیں کہ آیت کا مقتضا تو وہی ہے (جو شیعہ کہتے ہیں) مگر ہم نے باطن (کی عصمت) کا اعتبار ترک کر دیا۔ لہٰذا صرف ظاہری عدالت کا اعتبار باقی رہے گا ـــــــ"

اس کلام کو پڑھ کر اہل فہم یقیناً غرق حیرت ہو کر یہ سمجھنے سے قاصر رہیں گے کہ جب کلام الٰہی کا مقتضٰی یہ ہے کہ امام کو ظاہراً باطناً معصوم ہونا چاہیئے تو فخر الدین رازی اور ان کے دیگر اصحاب کو اعتبار باطن کے ترک کر دینے کا حق کیونکر حاصل ہوا۔ اور آخر یہ کہاں تک جائز ہو سکتا ہے کہ مقتضائے کلام الٰہی غیر معتبر ہو جائے اور امام فخر الدین رازی کی رائے معتبر رہے۔؟

اس سے عجیب تر یہ ہے کہ اس کلام میں تسلیم کر لیا گیا ہے آیت میں امامت سے نبوت مراد نہیں ہے حالانکہ اس سے پہلے متعدد فرضی دلیلوں سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ یہاں امام سے نبی مراد ہے۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

ترجمہ:۔ (اے رسولؐ وہ وقت بھی یاد دلاؤ) جب ہم نے خانۂ کعبہ کو لوگوں کے ثواب اور پناہ کی جگہ قرار دی اور (حکم دیا کہ) ابراہیم کی (اس) جگہ کو نماز کی جگہ بناؤ اور ابراہیم و اسمٰعیل سے عہد و پیمان لیا کہ میرے (اس) گھر کو طواف اور اعتکاف اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے واسطے صاف ستھرا رکھو اور (اے رسول وہ وقت بھی یاد دلاؤ) جب ابراہیم نے دعا مانگی کہ اے میرے پروردگار اس (شہر) کو پناہ و امن کا شہر بنا۔ اور اس کے رہنے والوں میں سے جو خدا اور روز آخرت پر ایمان لائے۔ اسکو طرح طرح کے پھل کھانے کو دے۔ خدا نے فرمایا (اچھا مگر) جو کفر اختیار کرے گا۔ اس کو

دنیا میں چند روز ان چیزوں سے فائدہ اٹھانے دونگا۔ پھر (آخرت میں) اسکو مجبور کر کے دوزخ کی طرف کھینچ لے جاؤں گا۔ اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے اور (وہ وقت بھی یاد دلاؤ) جب ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ خانۂ کعبہ کی بنیادیں بلند کر رہے تھے (اور دعا مانگتے جاتے تھے کہ) اے ہمارے پروردگار ہماری (یہ خدمت) قبول کر بیشک تو ہی (دعا کا) سننے والا (اور نیت کا) جاننے والا ہے۔"

آیات مذکورہ بالا میں بنی اسرائیل کو خاص طور سے ان نعمتوں کو یاد دلایا گیا ہے جو خانۂ کعبہ کی بدولت انھیں حاصل ہوئیں اور وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) خانۂ کعبہ کو ہر زمانہ کیلئے محل ثواب اور مرجع انام بنایا۔

(۲) اسے منزل امن و امان بنا دیا۔ حد یہ ہے کہ اگر مجرم بھی وہاں آ کر پناہ لے تو اسکے حدود میں گرفتار نہیں جا سکتا۔

(۳) مقام ابراہیم کو مصلّٰی قرار دیا۔ چونکہ اس پتھر پر نشان قدم حضرت ابراہیم کے ابھرے ہوئے ہیں لہٰذا ان کی نبوت کی یہ ایک دلیل بھی ہے۔ وہاں پر ہر حاجی کو دو رکعت نماز طواف پڑھنا واجب ہے۔

(۴) خانۂ کعبہ کو پاک رکھنے کی ذمہ داری دو معصوم ہستیوں کے سپرد کر کے اسکی طہارت کے بلند معیار کو بتایا ہے۔

(۵) خانۂ کعبہ کیوجہ سے جناب ابراہیم نے شہر مکہ کے لئے دعا کی کہ پورے شہر کو امن و امان کی جگہ بنا دے۔ چنانچہ نہ وہاں کوئی پرندوں کو شکار کر سکتا ہے اور نہ کسی درخت کو کاٹ سکتا ہے

(۶) جناب ابراہیم نے وہاں کے صاحبان ایمان باشندوں کے لئے یہ بھی دعا کی کہ وہ ہمیشہ خوش حال رہیں اور لوگوں کی توجہ ان کی طرف مبذول رہے۔

(۷) خانۂ کعبہ کی تجدید جناب ابراہیم اور جناب اسمٰعیل کے ہاتھوں ہوئی اور بہ نیت عبادتخانہ ہوئی جبھی تو اس عمل کے قبول کرنے کی دعا مانگی (اس دعا کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے)

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝

ترجمہ:۔ (اے ہمارے پالنے والے تو ہمیں اپنا فرمانبردار بندہ بنا، اور ہماری اولاد سے ایک گروہ (پیدا کر) جو تیرا فرماں بردار ہو۔ اور ہم کو ہمارے حج کے مقامات دکھا دے۔ اور ہماری توبہ قبول کر۔ بیشک تو بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔)"

"اسلام" کے لغوی معنی "اطاعت اور فرمانبرداری" ہیں۔ اور مقصودِ دعا یہ ہے کہ اے خدا تو ہم کو اپنی اطاعت و فرمانبرداری پر ثابت قدم رکھ اور اس میں زیادتی کی توفیق عطا فرما۔ اور ہماری اولاد میں بھی ایک طبقہ کو ہمارے کردار پر چلا۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

ترجمہ:- "اے ہمارے پالنے والے مکہ والوں میں انھیں میں سے ایک رسول کو بھیج جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور آسمانی کتاب اور عقل کی باتیں سکھائے۔ اور ان (کے نفوس) کو پاکیزہ کر دے۔ بیشک تو ہی غالب اور صاحبِ تدبیر ہے۔"

(۱) عام طور پر "فیہم" کا ترجمہ "مکہ والوں میں" کیا جاتا ہے لیکن عمومی مفہوم ہے "فیہم" کے خصوصی معنیٰ "امتِ مسلمہ میں" کرنا مناسب ہے۔ کیونکہ اس کے قبل کی آیت میں جناب ابراہیم نے اپنی ذریت میں سے ایک امت مسلمہ ہونے کی دعا فرمائی ہے۔

(۲) جناب ابراہیم کی پہلی دعا (امت مسلمہ کے متعلق) اگرچہ مقبول ہے لیکن اس کے بعد بھی اس امت کے لئے خدا سے ایک ہادی کے لئے دعا فرماتے ہیں۔ گویا ایک ضابطہ پیش فرماتے ہیں کہ امت مسلمہ کو اپنی جگہ پر مستغنی نہ ہونا چاہیئے۔

(۳) یہ امت مسلمہ مخصوص اس ذریت سے ہوگی جو نسل جناب اسمٰعیلؑ ہوگی۔ اس سے نسل جناب اسحٰقؑ کو مراد لینا غلط فہمی ہے۔

(۴) تاریخ نے یہ بات طے کر دی ہے کہ نسل جناب اسمٰعیل میں ان کے بعد بجز پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ و آلہ اور کوئی رسول نہیں ہوا۔ لہٰذا اس دعا سے مقصود صرف ہمارے نبی ہیں۔ چنانچہ آپ کا یہ ارشاد موجود ہے۔ انا دعوۃ ابی ابراھیمؑ و بشارۃ عیسٰیؑ (میں اپنے پدر بزرگوار جناب ابراہیم کی دعا (کا نتیجہ) ہوں اور جناب عیسٰی کی خوشخبری ہوں۔ آخری جملہ قرآن مجید کی اس آیت کی طرف اشارہ کرتا ہے مبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد یعنی میں بشارت دہندہ ہوں ایک ایسے رسول کی جو میرے بعد آئے گا۔ جس کا نام احمدؐ ہے۔

(۵) تلاوت آیات اور تعلیم کتاب میں تکرار نہیں ہے بلکہ دونوں کے مفہوم جدا جدا ہیں تلاوت آیات کا مقصد یہ تھا کہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ یہ آیتیں معجزہ ہیں اور صدق نبی پر دلالت کرتی ہیں۔ تعلیم کتاب سے مقصود یہ تھا کہ لوگ مسائل توحید و احکام شریعت سے واقف ہو جائیں۔

(۶) حکمت سے مقصود وہ روشنی ہے جس سے قلب پر حقائق کا انکشاف ہونے لگے۔ مفسرین نے اس لفظ کی توضیح میں ایک رخ کو مراد لیا ہے۔ اسی لئے ان کے اقوال مختلف نظر آتے ہیں۔

(۷) یزکیھم سے مقصود یہ ہے کہ نبی کریم انھیں اللہ کا مطیع و مخلص بندہ بنائیں گے۔ خواہ شرک و معصیت سے دور رکھ کے با ایمان و صلاح کی طرف دعوت دیکر۔ لہٰذا یہاں پر بھی مفسرین کا اختلاف بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

وَمَن يَرْغَبُ عَن مِّلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا مَن سَفِهَ نَفْسَهُ ۚ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا ۖ وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ۝

ترجمہ:- اور کون ہے جو ابراہیم کے طریقے سے نفرت کرے مگر وہ جو اپنے کو خود احمق بنا لے۔ اور بے شک ہم نے انکو دنیا میں بھی منتخب کر لیا اور وہ آخرت میں بھی یقیناً اچھوں ہی میں سے ہوں گے)

(۱) چونکہ عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ سب کے سب جناب ابراہیم کی تعظیم پر متفق تھے اس لئے انکو بتایا گیا کہ دین اسلام ملت ابراہیمی ہے پس اسکی پیروی سے بے عقل اور ناداں کے سوا اور کوئی نہیں انکار کر سکتا۔ نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کا مذہب جس کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے عقلی تھی اور یہی اہل حق کا مذہب ہے۔ اور اس حسن و قبح اشیاء کے عقلی ہونے کی گتھی بھی سلجھ گئی۔

(۲) متعدد آیات قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ دین اسلام ملت ابراہیمی ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ شریعت اسلام شرائع سابقہ کی ناسخ نہ رہی۔ کیونکہ نسخ کے لئے بھی ضروری نہیں ہے کہ شرائع سابقہ کے احکام کے خلاف احکام جاری کیے جائیں بلکہ اس سے پہلے مذکور ہو چکا کہ اگر ان کو باقی رکھ کر ضرورت زمانہ کے موافق دیگر احکام جدیدہ بھی نافذ کیے جائیں تو سب کا مجموعہ ایک نئی شریعت بن جائے گا۔ جس کے اعتبار سے اگلی شریعتیں اس لئے منسوخ قرار پائیں گی کہ ان کے احکام اب جدید شریعت کے احکام بن گئے۔ لہٰذا ان کا وجود مستقل شریعتوں کی حیثیت میں باقی نہ رہا اور دین اسلام کی یہی حالت ہے کہ احکام جدیدہ کے علاوہ ملت ابراہیمی کے احکام اس میں داخل کر دئے گئے ہیں۔ اور اسی اعتبار سے خداوند عالم نے اسکو ملت ابراہیمی فرمایا ہے۔

إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ ۖ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

ترجمہ:- (جب ان کے پروردگار نے کہا کہ اطاعت پر جمے رہو تو عرض کی کہ میں سارے جہان کے پروردگار کی اطاعت پر قائم ہوں۔)

اس سے پہلے مذکور ہوا کہ اسلام کے لغوی معنی اطاعت کے ہیں پس مقصد اسکا یہ ہے کہ تم خدا کی اطاعت و فرمانبرداری پر ثابت قدم رہو۔

وَوَصَّىٰ بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ يَا بَنِيَّ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝ أَمْ كُنتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِن بَعْدِي قَالُوا نَعْبُدُ إِلَٰهَكَ وَإِلَٰهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَٰهًا وَاحِدًا وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۝ ترجمہ:- (اور اسی طریقہ کی ابراہیم نے اپنی اولاد سے وصیت کی اور یعقوب نے (بھی) کہ اے فرزندو بلاشبہ خدا نے تمہارے واسطے اس دین اسلام کو پسند فرمایا۔ تم ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان ہی ہو کر (اے یہود) کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کے سر پر موت آکھڑی ہوئی اس وقت انھوں نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ میرے بعد کس کی عبادت کروگے، کہنے لگے۔ ہم آپ کے معبود اور آپ کے آباء (باپ دادا) ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ و اسحاقؑ کے معبود یکتا خدا کی عبادت کریں گے۔ اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔)

رب العزت نے ان آیات میں چند امور کیطرف اشارہ کیا ہے:-

(۱) وصیت کے لفظ سے اس دین کی اہمیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور یہ کہ یہ سلسلۂ وصیت برابر اولاد ابراہیمؑ پر جاری رہا۔

(۲) چونکہ یہود نے پیغمبر اسلام سے کہا تھا کہ کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے اپنی اولاد کو یہودیت کی وصیت کی تھی۔ تو اس آیت کا نزول ہوا۔ کہ تم خود اس وقت غیر حاضر تھے۔ یعقوب کی وصیت یہ تھی ....

(۳) جناب یعقوب نے وصیت میں اپنے باپ اسحاقؑ سے قبل اپنے چچا اسمٰعیل کا ذکر اس لئے کیا کہ وہ اسحاقؑ سے بزرگ تھے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ محاورۂ عرب میں "اب" کی لفظ عم (چچا) کے لئے بھی رائج تھی۔ اس قرآنی شہادت کے بعد اگر "اب" کی لفظ جناب ابراہیمؑ نے آذر کے لئے استعمال کی۔ تو اس سے اسکا حقیقی باپ ہونا نہیں ثابت ہوتا ہے۔ تاکہ اس سے متمسک

کر کے کوئی آبائے نبی کا کفر ثابت کرے۔

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ ترجمہ (اے یہود) وہ لوگ وہ تھے جو چل بسے جو انھوں نے کمایا وہ ان کے آگے گیا۔ اور جو تم کماؤ گے تمہارے آگے آئے گا۔ اور جو کچھ وہ کرتے تھے ان کی پوچھ گچھ تم سے نہیں ہوگی۔)

مطلب یہ ہوا کہ تمہارا ان کی طرف صرف انتساب کر لینا تمہاری نجات کے لئے کافی نہ ہوگا بلکہ جزا عمل پر مرتب ہوگی۔ اس آیت میں مجبرہ وغیرہ کی بھی رد ہے مجبرہ کا عقیدہ یہ ہے کہ باپ دادا کے قصور پر اولاد سے محاسبہ ہوگا۔ حالانکہ یہ آیت صریحی طور پر اس کی نفی کر رہی ہے

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ ترجمہ:- (یہود و نصاریٰ مسلمانوں سے) کہتے ہیں کہ تم یہودی یا نصرانی ہو جاؤ تو راہ راست پر آجاؤ گے (اے رسولؐ ان سے) کہہ دو کہ تم ابراہیم کے طریقہ پر چلو جو باطل سے کترا کر چلتے تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے)

(۱) "مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ" سے پہلے لفظ "اتبعوا" مقدر ہے لہٰذا معنی آیت یہ ہے کہ تم ملت ابراہیمؑ کی پیروی کرو۔

(۲) حنف کے لغوی معنی میل و انحراف ہیں۔ "حَنِيفًا" کہنے کا مقصود یہ ہے کہ جناب ابراہیمؑ تمام ادیان باطلہ سے منحرف اور دین الٰہی پر ثابت قدم تھے۔

قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۝ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا ۖ وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ۖ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (ترجمہ) اے مسلمانو! تم ان سے کہو کہ ہم تو خدا پر ایمان لائے ہیں اور اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا۔ (قرآن) اور جو صحیفے ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ و اسحٰقؑ و یعقوبؑ اور اولاد یعقوب پر نازل ہوئے تھے (ان پر) اور جو کتاب موسیٰؑ و عیسیٰؑ کو دی گئی (اس پر) اور جو اور پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف انھیں دیا گیا (ان سب پر) ہم تو ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے۔ اور ہم تو خدا ہی کے

فرمانبردار ہیں۔ پس اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لاتے ہیں جسطرح تم تو البتہ راہ راست پر آگئے۔ اور اگر وہ اس طریقے سے منہ پھیرلیں تو بھی وہ صرف تمہاری ضد پر (کمر بستہ) ہیں۔ (تو اے رسول!) ان کے شر سے (بچانے کو) تمہارے لئے خدا کافی ہوگا۔ اور وہ (سب کی حالت) خوب جانتا (اور سنتا ہے)

(۱) اس آیت میں اہلِ اسلام کو یہ اعتقاد رکھنے کا حکم دیا گیا ہے کہ تمام انبیاءؑ اور ان کے صحف سماویہ اپنے زمانہ میں حق اور واجب الاتباع تھے۔ یہ حکم نہیں دیا گیا ہے کہ انبیائے سابقین کو اپنا نبی سمجھیں اور ان کی شریعتوں کی پیروی کریں۔

(۲) "اسباط" سے اولاد یعقوب مراد ہیں اور ان کی بابت فرقۂ امامیہ کا عقیدہ یہ ہے کہ سب کے سب انبیاءؑ نہ تھے کیونکہ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو جناب یوسفؑ کے معاملہ میں معصیت کے مرتکب ہوئے تھے۔ اور نبی کے لئے عصمت لازم ہے۔

یہ آیت فقط یہ بتاتی ہے کہ "اسباط" پر صحیفے نازل کئے گئے تھے۔ لیکن اس سے تمام اسباط پر نازل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ز وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ

(اے رسول کہدو کہ) رنگ تو خدا ہی کا رنگ ہے۔ اور خدائی رنگ سے بہتر کون رنگ ہوگا اور ہم اسی کی عبادت کرتے ہیں)

نصاریٰ اپنے بچوں کو تطہیر کی غرض سے زرد رنگ پانی میں غسل دیتے اور اس پانی کو "معمودیہ" کہتے تھے۔ اس آیت میں ان کو بتایا گیا ہے کہ طہارت "معمودیہ" سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اس کا وسیلہ خدا کا رنگ یعنی دین اسلام کی تعبیر رنگ سے بطور صنعت مشاکلہ کی گئی ہے۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ
لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ○ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ
وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ط قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ط وَمَنْ
اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ط وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○
تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْــَٔلُوْنَ عَمَّا
كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ:- (اے رسول!) تم ان سے پوچھو کہ کیا تم ہم خدا کے بارے میں جھگڑتے ہو۔ حالانکہ ہمارا (بھی) پروردگار ہے) اور وہی تمہارا بھی (پروردگار) ہے

ہمارے لئے ہیں ہماری کارگذاریاں اور تمہارے لئے ہیں۔ تمہاری کارستانیاں اور ہم تو نرے کھرے اسی کے ہیں کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم و اسمٰعیل و اسحٰق و اولاد یعقوب سب کے یہودی یا نصرانی تھے۔ (اے رسول اُن سے) پوچھو کہ تم زیادہ واقف ہو یا خدا۔؟ اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جس کے پاس خدا کی طرف سے گواہی (موجود) ہو (کہ وہ یہودی نہ تھے) اور وہ پھر چھپائے اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے بے خبر نہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو سدھار چکے جو کچھ وہ کما گئے ان کے لئے تھا۔ اور جو کچھ تم کماؤ گے تمہارے لئے ہوگا۔ اور جو کچھ وہ کر گذرے اس کی پوچھ گچھ تم سے نہ ہوگی۔(۱)

(۱) خدا کے بارے میں یہود کے مباحثہ کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ ذات خدا کے متعلق بحث کرتے تھے بلکہ دین خدا کے باب میں جھگڑتے تھے۔ وہ اپنے دین کو قدیم کہتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ عرب بت پرست ہیں ان میں آجتک کوئی نبی نہیں ہوا اور تمام انبیاء ہم میں سے ہوتے چلے آئے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ ادھر سے ان تمام دعاوی کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے وہ منزل رسالت کو خوب جانتا ہے اور یہ کہ بار نبوت کون اٹھا سکتا ہے۔ رہے اعمال تو ہمارے اعمال ہمارے ساتھ ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے ساتھ۔ قوم کے بت پرست ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ ہمارے اخلاص کو تم کیا جانو۔ تمہارے بزرگ بھی تو گوسالہ پرستی میں مبتلا رہے لیکن اگر تم اس کو برا سمجھتے ہو تو اس قصہ کی وجہ سے کوئی تم پر عیب گیری نہیں کر سکتا۔ پس اسی طرح اگر عرب بت پرست رہے تو ان سے علیحدہ ہو جانے والوں پر تم کس طرح حرف گیری کر سکتے ہو۔

(۲) یہود و نصاریٰ کا یہ خیال کہ جناب ابراہیمؑ اور انکی ذرّیت یہودی یا نصرانی تھی قرآن مجید کے اس ایک فقرہ سے باطل ہو جاتا ہے کہ انتم اعلم ام اللہ تم زیادہ واقف ہو یا خدا۔ سوچنے کی بات ہے کہ یہودی یا نصرانی نام ان لوگوں کا پڑا جو شریعتِ موسیٰ یا شریعتِ عیسیٰ کے پیرو تھے اور جناب ابراہیمؑ وغیرہ تو نزول توریت و انجیل سے بہت پہلے گذرے ہیں پھر تم ان حضرات کو یہودی یا نصرانی کس دلیل سے کہتے ہو خصوصاً جبکہ تمہاری کتابوں میں ذکر ہے کہ ابراہیم دین حنیف پر تھے۔

(۳) یہود و نصاریٰ کے پاس جو شہادتیں پیغمبر اسلام کی حقانیت کے متعلق تھیں انھیں چھپانے کی وجہ سے وہ بہت بڑے ظالم قرار پائے۔ آیت کا مورد اگرچہ خاص ہے لیکن

اس سے عام طور پر کتمانِ شہادت کا گناہ عظیم ہونا ظاہر ہے۔ البتہ متعلق کے اعتبار سے ظلم کی عظمت اور گناہ کی شدت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ مثلاً عام حقوق بندگانِ خدا کے باب میں شہادت چھپانے کا گناہ اور ہوگا۔ لیکن منصب نبوت یا منصب امامت کے بارے میں کتمانِ شہادت کا مظلمہ اور ہوگا۔ کتمانِ شہادت کے "ظلم عظیم" سے خداوند کریم جملہ ارباب دیانت کو محفوظ رکھے۔ آمین۔

مرکز احیاء آثار برصغیر
MAAB 1431
maablib.org